علمی وادبی سرزمین سے ہے یا اب انھوں نے یہیں مستقل بود و باش اختیار کرلی ہے، یا وہ آرزو لکھنوی کے سلسلۂ فیض سے جڑے ہوئے ہیں، گو اس کتاب میں اصلاً شعری کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے مگر ایک مضمون ڈاکٹر خورشید نعمانی کی نثری نگارشات کے جائزہ پر بھی مشتمل ہے، سراج لکھنوی کی شہرت غزل گو کی حیثیت سے ہے مگر مصنف نے اس سے قطع نظر ان کی ناقدانہ و مبصرانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے، اور انھیں محب وطن شاعر بھی دکھایا ہے، متین فتحپوری کی بھی ناقدانہ اور شاعرانہ دونوں خصوصیتوں کو نمایاں کیا گیا ہے، اور قمر وارثی کی نعت گوئی پر اظہار خیال کیا ہے، اس مجموعہ کا پہلا مضمون قابل توجہ ہے، اس میں آرزو لکھنوی کے تصور خالص اردو کی مدلل وضاحت کی گئی ہے، ایک اور مضمون میں ان کے تلمیذ خاص جناب ابو الحسن جرم محمد آبادی کے کلام پر مفصل تبصرہ کے ضمن میں آرزو کی بعض اصلاحات کا ذکر بھی آگیا ہے، مصنف نے ان حضرات کے صرف فنی کمالات اور ادبی خدمات ہی کو نمایاں کرنے کی سعی نہیں کی ہے، بلکہ ہر ایک کی پیدائش، تعلیم، ماحول اور بقدر ضرورت حالات بھی تحریر کیے ہیں، انھوں نے ہر مذہب و ملت کے اہل کمال کی جانب اعتنا کرکے اپنی بے تعصبی اور فراخ دلی کا ثبوت بھی دیا ہے، ان مضامین سے ڈاکٹر صاحب کے اچھے ادبی و تنقیدی ذوق و صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، ان کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ اپنے ممدوحین کی تعریف میں افراط و مبالغہ سے محفوظ رہے ہیں، یہ اشخاص خوش قسمت ہیں کہ ڈاکٹر افضال نے ان کے نام نیک کو ضائع ہونے سے بچالیا۔

اسہل التجوید: مرتبہ حافظ قاری محمد الیاس اعظمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۹۶ قیمت ۵ روپے، پتہ: مکتبہ نعیمیہ صدر بازار، مئوناتھ بھنجن (یو۔پی)

قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کے لیے قرات و تجوید کے فن سے واقفیت ضروری ہے اس لیے اس پر بہت سی مفید کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب آسان انداز اور سوال و جواب کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے اس کی وجہ سے مسائل بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور مبتدیوں اور فن سے ناواقف لوگوں کے لیے بھی ان کو سمجھنا آسان ہوگیا ہے، نوجوان مصنف دار المصنفین کے شعبۂ کتابت سے وابستہ ہیں، اس کتاب سے اندازہ ہوا کہ ان کو تحریر و تالیف کا شوق و ذوق بھی ہے، اللّٰھم زد فزد۔

"ض"

جلد ۱۴۲ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات

گزشتہ برس کی شورش وہنگامہ کے اندیشہ کی بنا پر اس سال حج کے موقع پر سعودی حکومت نے بڑے پیمانے پر حفاظتی اقدامات کیے تھے مگر الحمدللہ اس سال کوئی پرتشدد واقعہ رونما نہیں ہوا، اور لوگوں نے پُرامن ماحول میں فریضۂ حج ادا کیا، لیکن ہندوستان میں ریاستی اور مرکزی حج کمیٹیوں کی نااہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے بالخصوص یوپی کے عازمین حج پر قیامت گذر گئی، یہ بیچارے خدا کے متبرک گھر کی زیارت اور حج کا مقدس فرض ادا کرنے کا ارمان لے کر اپنے گھروں سے روانہ ہوئے تھے مگر ان میں سے ہزاروں دلی میں در در کی ٹھوکریں کھا کر نامراد واپس لوٹ آئے، اور حج وزیارت کی تمنا دل کی دل ہی میں لیے رہ گئے، ان کے پاسپورٹ، ڈرافٹ، ٹکٹ اور ضروری کاغذات نامکمل اور غلط تھے یا یہ انھیں اس قدر تاخیر سے ملے کہ اس سے پہلے ہی جہاز روانہ ہوچکا تھا، ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی مکمل تفصیل اخباروں میں آچکی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حج کمیٹی کے ذمہ داروں نے سخت بے پروائی کا ثبوت دیا، بلکہ انھوں نے عازمین حج کے ساتھ بہت افسوسناک اور ناقابل برداشت قسم کا مذاق کیا جس کی وجہ سے اتنے سارے لوگ حج بیت اللہ کی سعادت سے محروم رہے۔

اس سے زیادہ عجیب اور دکھ کی بات یہ ہے کہ ذمہ داروں کو اپنی کوتاہی، حج کے مسافروں کی پریشانی اور ان سے کیے جانے والے ناروا سلوک پر کوئی ندامت اور شرمندگی نہیں، حج کمیٹیاں ایک دوسرے کو مورد الزام قرار دے رہی ہیں، دلی کی حج کمیٹی بمبئی کی مرکزی حج کمیٹی پر اور یوپی کی حج کمیٹی اس پر ساری ذمہ داری عائد کر رہی ہے، حالانکہ یوپی کی حج کمیٹی کے ذمہ دار افسر اور اعلیٰ حکام عازمین حج کی روانگی کی آخری تاریخ سے کئی روز پہلے ہی انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر مکہ معظمہ روانہ ہوگئے، اور حج کمیٹی کا دفتر تقریباً خالی ہوگیا، مسافروں کی فریاد سننے والا کوئی

نہیں رہ گیا تھا جس کے پاس جاتے، وہ ان کی پریشانی دور کرنے کے بجائے ان پر اپنا غصہ اتارتا، اس سے پہلے بحری جہاز کے لیے قرعہ اندازی میں یوپی حج کمیٹی کے دفتر میں جو کچھ ہوا، ابھی اس کو لوگ بھولے نہیں ہیں، دلی کی حج کمیٹی نے زائرین حرم کی رہائش کے لیے برسات کے موسم میں ٹین کا ایک شیڈ ڈال دینا کافی سمجھا، اور پنکھے، روشنی، پانی اور رفع حاجت کے انتظام سے غافل رہی، اُدھر مکہ معظمہ میں حکومت ہند کی جانب سے رہائش کا جو انتظام ہوا اس کی بھی شکایتیں سننے میں آئی ہیں۔

ہر طرف سے ان واقعات کی شدید مذمت ہورہی ہے، اور ان کی تحقیق، حج کمیٹیوں کی ازسرنو تشکیل اور عہدہ داروں اور ذمہ داروں کے استعفا کا مطالبہ کیا جارہا ہے، بالآخر حکومت بھی حج کمیٹی کی ناکامی کے اسباب کی جانچ پر رضامند ہوگئی ہے، ضرورت ہے کہ تحقیق کے بعد جو لوگ قصور وار ثابت ہوں ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، تاکہ آئندہ حتمی طور پر اس کا سدباب ہوجائے، اور حج جیسی مقدس عبادت ہر قسم کی بدعنوانی سے محفوظ رہے، اللہ کے مہمانوں کے ساتھ کھیل تماشا کرنے والے کسی رو رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔

پورے ملک میں بہار و اڑیسہ کو "امارت شرعیہ" قائم کرنے کا فخر و امتیاز حاصل ہے، اسکے زیر انتظام عرصہ سے قضا کا نظام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے، اس کی بدولت شرعی قوانین کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں، اور مسلمانوں کو اپنے اکثر مقدمات کے لیے سرکاری عدالتوں سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، معلوم ہوا ہے کہ بہار کی سرکاری عدالتیں بھی دارالقضاء کے فتوے اور فیصلے کا احترام کرتی ہیں، اور ان کو باوزن مانتی ہیں، انصاف کو صحیح اور جلد ہونا چاہیے مگر سرکاری عدالتوں میں مقدمات کے فیصلے اتنی تاخیر سے ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی تو انصاف چاہنے والے کی زندگی ہی کا خاتمہ ہوچکا ہوتا ہے، روپے پیسے کا ضیاع، زحمت اور پریشانی الگ ہوتی ہے

لیکن دارالقضاء سے مقدمات کا تصفیہ جلد ہوتا ہے، اور لوگوں کو زحمت اور پریشانی بھی نہیں اٹھانی پڑتی، کچھ ماہ پہلے امارت کے سجاد اسپتال کا افتتاح کرتے ہوئے بہار کے وزیر اعلیٰ مسٹر بھگوت جھا آزاد نے کہا تھا: "ہمیں تعجب ہے کہ پھلواری شریف کے دارالقضاء نے سترہ ہزار سے زائد فتوے اور فیصلے کیے ہیں، اور ہماری ٹریجڈی ہے کہ لوور کورٹ، ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے فیصلے تک انصاف پانے والا جاتے جاتے مر جاتا ہے، بڑا طویل مرحلہ ہے۔"

اس معاملہ میں ہر جگہ کے مسلمانوں کو بہار کی تقلید کرنی چاہیے، کیونکہ انصاف کے قیام، حقوق کی حفاظت اور شریعت کے نفاذ کے لیے قضا کے شرعی نظام کا قیام ناگزیر ہے، یہ وقت کی ایک بڑی اہم ضرورت اور مسلمانوں کا شرعی و اجتماعی فریضہ ہے، دینی جماعتوں اور ملی اداروں کو بھی اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کرنی اور اس کے لیے منظم جدوجہد کرنی چاہیے، اگر قضا کا نظام ملک کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر قائم ہو جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور طرز معاشرت کو جو خطرات لاحق ہیں اس سے بڑی حد تک ان کا خاتمہ ہو جائے اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا سامان بھی ہو جائے، نظام قضا کے قیام میں گوناگوں دنیاوی فائدے بھی ہیں، ان کے پیش نظر سارے ملک میں دارالقضا قائم کرنا اور اسلامی عدالتوں کا جال بچھانا دینی و ملی فرض ہے، اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کو نافذ و جاری کرنے ہی سے دنیا میں عدل و قسط کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی اسلامی بنیادوں پر منظم اور مستحکم ہو سکتی ہے، لکھنؤ میں اس اہم کام کا آغاز ہوا ہے جس کو موثر اور منظم کرنے کے لیے بڑی جدوجہد اور سخت جانفشانی کرنی ہوگی۔

پاکستان میں دارالمصنفین کے قدردانوں کا بڑا وسیع حلقہ ہے، ایک کرم فرما نے جن کو اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یاد میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی تقریباً ایک صد مطبوعات دارالمصنفین کو ندر کی ہیں، ان کی دوسری قسط بھی مل گئی ہے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، ہم اپنے ان نادیدہ اور نام و نمود سے بیزار مہربان کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔

مقالات

عمید الدولہ ابوالحسن فائق الخاصہ امیر الجیوش سامانیان

از

پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

فائق الخاصہ کا شمار سامانی دور کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا ہے، آخری چار سامانی حکمرانوں یعنی منصور بن نوح، نوح بن منصور، ابوالحارث منصور بن نوح، عبدالملک بن نوح (۳۵۰ھ تا ۳۸۹ھ) کے دور میں اس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہونچ چکا تھا، اور بعض حکمرانوں کے عہد میں امور سلطنت میں اس کا دخل اتنا بڑھ گیا تھا کہ کوئی اہم کام اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ وزرائے سلطنت کے تقررات بھی اس کے مشورے سے ہوتے، سیاسی فہم و بصیرت کے ساتھ ساتھ وہ علم کی دولت سے بھی آراستہ تھا، ذیل میں اس کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں تاریخوں اور تذکروں کی مدد سے ایک گذارش پیش کی جا رہی ہے۔

ابن الفوطی نے مجمع الآداب[1] میں اس کا لقب عمید الدولہ اور کنیت ابوالحسن درج کی ہے، یہی لقب و کنیت بیرونی کی آثار الباقیہ[2] میں پائی جاتی ہے، بیرونی کی روایت یہ ہے کہ عمید الدولہ کا لقب خلفائے عباسی میں سے کسی خلیفہ کا دیا ہوا ہے، لیکن یہ قول درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ

---

[1] جز ۴، قسم دوم ص ۹۳۵ - ۹۳۶ [2] ترجمۂ فارسی ص ۱۷۶ - ۱۷۷۔

فائق کا تعلق خلفاے عباسی سے نہ تھا، بیرونی نے بعض اور نامور اشخاص کے لقب جو سامانیوں کے دیے ہوئے تھے، ان کو خلفاے عباسی کا عطا کردہ[1] بتایا ہے، بظن قوی یہ لقب کسی سامانی حکمراں کا عنایت کردہ ہے، تاریخ بیہقی میں فائق[2] کا ایک قول نقل ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امیر ابو الحارث منصور بن نوح نے ایک روز اس سے کہا کہ تمھارا لقب جلیل دیا ہوا ہے، حالانکہ تو جلیل نہیں، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کا لقب جلیل بھی ہوگا (ص ۶۴۱)۔ مجمع الآداب میں منقول ایک بیت سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، مجمع الآداب سے یہ معلوم ہوا کہ "الخاصہ" کا اختصاص امیر سدید منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۵) کی طرف سے بخشا گیا تھا، اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تخصیصی نام کسی اور امیر کا مذکور نہیں، ابن الفوطی نے اس کو امیر الجیوش لکھا ہے، لیکن یہ بالکلیہ صحیح نہیں، در اصل امیر الجیوش سپہ سالار کو کہتے ہیں، اور اس کا عہدہ سپہ سالار کا نہ تھا، منصور بن نوح کے زمانہ میں سپہ سالاری کا عہدہ سنہ ۳۵۰ھ میں ابو الحسن محمد بن ابراہیم[3] سیمجوری کو دیا گیا، نوح بن منصور ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا تو اس نے ابو الحسن محمد سے رشتہ کرلیا، اور سپہ سالار کا عہدہ برقرار رہا، لیکن سنہ ۳۷۱ھ میں حاجب تاش کو امیر رضی نوح بن منصور نے حسام الدولہ کا لقب دے کر

[1] مثلاً بیرونی کے بقول سبکتگین کا لقب ناصر الدولہ والدین، محمود کا سیف الدولہ، ابو علی سیمجوری کا عماد الدولہ، بیستون بن وشمگیر کا ظہیر الدولہ، ابو الحسن سیمجوری کا ناصر الدولہ، تاش حاجب کا حسام الدولہ خلفائے عباسی کے دیے ہوئے ہیں، لیکن صاحب زین الاخبار نے یہ سارے القاب سامانی حکمراں کے دیے ہوئے بتائے ہیں، رک صفحات ۱۷۰، ۱۶۸، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۲، ۱۶۸ وغیرہ، تاریخ بیہقی میں ہے کہ بکتوزون کو سنان الدولہ کا لقب منصور بن نوح سامانی (م ۳۸۷) کا دیا ہوا تھا، مگر بیرونی نے اس کو خلیفہ عباسی کا عطا کردہ قرار دیا ہے (آثار الباقیہ ترجمۂ فارسی ص ۱۷۷) جب بیرونی کے بیان میں اتنا سہو ہے تو فائق الخاصہ کا لقب بھی سامانیوں ہی کا دیا ہوا قرار دینا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے [2] زین الاخبار ص ۱۶۲۔

سپہ سالار بنا لیا،[1] ابو الحسن سیمجور اس امر سے ناراض تھا، چنانچہ ۳۷۶ھ میں نوح[2] نے پھر اس کو سپہ سالار مقرر کر دیا، ابو الحارث منصور بن نوح (۳۸۷ھ - ۳۸۹ھ) کے عہد میں بھی فائق سپہ سالار نہیں رہا تھا، اس لیے کہ اس نے سپہ سالاری کا عہدہ تو تاش[3] کو سونپا، فائق کے بارے میں[4] کہا گیا ہے:

"چوں نوح بمرد منصور بجائے او بنشست و ہنوز بالغ نشدہ بود، وزیر او ابو المظفر محمد ابن ابراہیم البرغشی بود و دیگر کارہا ہمہ فائق ہمی راند"

منصور کے باپ نوح کے عہد میں اگرچہ فائق کا اقتدار بہت زیادہ تھا، لیکن سپہ سالار ابو الحسن محمد سیمجوری ہی تھا، زین الاخبار[5] میں ہے:

"چوں نوح بن منصور بخلافت نشست ہنوز بالغ نبود، و با امیر ابو الحسن (سیمجور) و با ابو الحارث محمد بن احمد بن فریغون خویشی کرد، تا بدیشاں پشت او قوی گشت، و کارہائے خویش بہ فائق الخاصہ و تاش الحاجب سپرد، و چوں بولایت بنشست ابو عبد اللہ.. را برسولی نزدیک امیر ابو الحسن فرستاد و او را ناصر الدولہ لقب کرد و عہد و خلعت فرستاد و او را بہ سپہ سالاری الخ"

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ فائق الخاصہ کا اقتدار اگرچہ سپہ سالار سے کم نہ ہوگا، لیکن یہ عہدہ خالصۃً اس کے پاس کبھی نہیں رہا، البتہ جنگوں میں وہ فوجی دستے کا افسر اعلیٰ رہ چکا تھا۔

ابن الفوطی نے مزید لکھا ہے[6] کہ وہ چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی خراسان کے اکثر شہروں کا والی رہ چکا ہے، فائق کا اقتدار منصور بن نوح کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا، اور یہ اقتدار عبد الملک بن نوح کے عہد تک باقی رہا، یعنی سنہ ۳۵۰ھ تا سنہ ۳۸۹ھ، اس طرح اس کے اقتدار کی مدت تو چالیس کے قریب ہوتی ہے، لیکن واضح ہے کہ وہ والی نہ تھا، البتہ سنہ ۳۷۶ھ سے

[1] زین الاخبار ص ۱۶۶ [2] ایضاً ص ۱۶۷ [3] ایضاً ص ۱۷۲ [4] ایضاً ص ۱۷۱ [5] ایضاً ۱۶۵ [6] جز ۴، قسم دوم ص ۹۳۶۔

کچھ پہلے وہ بلخ کا حاکم ہوگیا تھا، اگرچہ اس کا اقتدار پوری مملکت میں تھا، زین الاخبار کی روایت[1] یہ ہے کہ ابوالحسن محمد سیمجوری نے فائق سے مل کر ایسی سازش کی کہ ابوالحسین عتبی وزیر مملکت قتل کر دیا گیا، اسکے بعد ابوالحسین مزنی وزیر مقرر ہوا، ان ہی دونوں کی سازش سے ابوالحسین مزنی قید کر دیا گیا، اور قید ہی میں مرگیا، اب ابوعلی پسر ابوالحسن سیمجوری اور فائق کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ نہ وزیر عبدالرحمٰن الفارسی کی کچھ چلتی تھی اور نہ سپہ سالار تاش کی، نوبت یہاں تک پہونچی کہ دارالملک کے چار والی مقرر کردیے گئے، نیشاپور تاش کو، بلخ فائق کو، ہرات ابوعلی سیمجوری کو، بادغیس و گنج رستاق اور قہقستان ابوالحسن سیمجوری کو ملے۔

ابن الفوطی نے مزید یہ اطلاع دی[2] ہے کہ فائق رومی تھا، اگرچہ "روم" کا تعین ذرا مشکل ہے، لیکن یہ روم وہی ہے جس کی نسبت سے مولانا جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) کہلاتے ہیں، وہ اپنے باپ بہاء الدین کے ساتھ بلخ سے ہجرت کر کے قونیہ پہونچ گئے، روم کے مشہور مقامات کے نام رشید الدین فضل اللہ نے ۳۶ ویں مکتوب[3] میں درج کیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: ارزنجان، سیواس، توقات، کینی، بالوآمد، قیصریہ، ملاطیہ، طرسوس، انطاکیہ، گوزل حصار، انگوریہ، تیرشہری، امامیہ، اسناف، کتامی، قونیا، عرب کرد، قلعہ کماخ، سنسون، ہتاخ، لارندہ وغیرہ، اگرچہ یہ معلوم نہیں

---

[1] دیکھئے زین الاخبار ص ۱۶۷۔ [2] جزء ۴ قسم دوم ص ۹۳۵ [3] مکاتبات رشیدی ص ۲۲۶ - ۲۲۷۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ روم غازان خان کے زمانہ میں ان کی مملکت کا ایک جزء تھا، اپنے بھانجے خواجہ معروف کو اپنے مخصوص چاکر جلال حاکم بصرہ کے بارے میں ایک خط ص ۵ ابجد میں لکھتا ہے: چوں علایم سعادت و اقبال از ناصیۂ چاکر خاص ما جلال واضح است و مدتے شد کہ حاکم بلدۂ اصفہان است و پیش ضمیر ما واضح است کہ عراق عجم بانسبت ہمت او حقیر و با وجود ہمت او صغیری نماید، مصلحت وراں ست کہ مملکت روم را کہ بلاد وسیع و دیار فسیح دارد بدو تفویض کنی و حکومت آں اطراف بتراد بجزاو بلاد و تغور مفوض داری و آیالت آں طرف بدو مسلم گردانی الخ۔

کہ روم کے کس شہر سے اس کا اور اس کے خاندان کا تعلق تھا، البتہ یہ یقینی ہے کہ وہ روم کا باشندہ تھا۔

ابن الفوطی کے تذکرہ سے اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ فائق الخاصہ بڑے درجہ کا عالم و فاضل تھا، علم حدیث سے خصوصاً اس کی دلچسپی تھی، اس کے دربار میں ہمیشہ اہل حدیث[1] کی مجلس اس کے پاس روایت کے لیے جمع رہتی، اور اس[1] میں مذاکرے ہوتے، اس نے بخارا میں سنہ ۳۵۰ھ میں احادیث املا کی، ۳۵۵ھ میں مؤلف تاریخ نیشاپور نے بخارا میں اس کی مجلس میں حاضری دی اور امہات کتب کے درس سے فائدے حاصل کیے، یہ منصور بن نوح کا دور تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اس کے زمانہ میں وہ سیاسی و دینی اعتبار سے بڑی اہمیت کا مالک تھا، یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس امیر کے سامنے قرآن مجید کی فارسی تفسیر و ترجمہ کا مسئلہ پیش ہوا اور بات طے ہوجانے کے بعد جن علماء کو یہ کام سپرد ہونے والا تھا ان کے ضمن میں فائق الخاصہ[2] کا بھی نام آتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ جب فائق اور بادشاہ کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے تو علماء و فقہاء کی جماعت[3] بیچ میں پڑی، ابوالحسن محمد سیمجوری بھی جس سے مدتوں فائق کے تعلقات استوار رہے، اور دونوں سامانی امراء کے

---

[1] ولم یزل عندہ مجمع اہل الحدیث للروایۃ ومجالس النظر، وعقد لہ الاملاء ببخاری سنۃ خمسین وثلاث مائۃ وانتقیت علیہ الفوائد من اصولہ ببخاری سنۃ خمس وخمسین (مجمع الآداب ۹۳)

[2] پس بیرون آمد فرمان امیر سدید ملک مظفر بہ دست کسہا و بزرگان و وزیراں او و ندیمان خاصہ او و خادم او ابوالحسن فائق الخاصہ سوئے ایں مرداں و علماء تا از ایشاں از میان خویش ہر کدام دانا تر اختیار کردند تا ایں کتاب را ترجمہ کنند الخ [3] امیر ابوالحسن (ابوالحسین) محمد بن ابراہیم سیمجوری امیر عبدالملک بن نوح کے زمانہ میں ۳۴۷ھ میں خراسان کا سپہ سالار مقرر ہوا، ۳۴۹ھ میں معزول ہوا، منصور بن نوح کے عہد میں سنہ ۳۵۰ھ میں پھر سپہ سالار مقرر ہوا، نوح بن منصور نے ناصر الدولہ کا لقب عطا کیا، ۳۷۸ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا ابوعلی اس کا جانشین ہوا (زین الاخبار ص ۱۶۰، ۱۶۲ - ۱۶۸)

دست دبازو تھے، علم وفضل کا دلدادہ تھا، سنہ ۳۵۰ھ میں جب منصور نے اس کو سپہ سالار مقرر کیا تو اس کے متعلق زین[1] الاخبار میں آیا ہے :

"بسیار نیکوئی کرد با رعیت وعدل بگسترد وسیاستے نیکو بنہاد ورسمہائے خوب آورد، وہمیشہ باہل علم نشستے واز ان زشتہا کہ پیش از وے رفتہ بود ہمہ را استمالت کرد ورسمہائے بد را براندا خت ۔"

ابوالحسن سیجوری کی شرافت واخلاص نوح بن منصور کے عہد میں باقی رہی، چنانچہ جس وقت اس نے سیجوری کو سپہ سالار متعین کیا، تو اس وقت اسے اس طرح کا پیغام[2] بھیجا کہ ہم نے تمہارے ساتھ تمہارے اندازہ سے زیادہ حسن سلوک کیا، اس لیے کہ تم میں وفا ورشد کی بہت سی نشانیاں موجود پائیں، خوب دیکھ لو، میرا خیال غلط نہ ہونے پائے، اور تین چیزیں تمہیں عنایت کیں، جو میرے اسلاف نے روا نہ رکھی تھیں، پہلا یہ کہ تم سے رشتہ داری کی، اور یہ تمہارے ساتھ میرے حسن عقیدت کی اور تمہاری بزرگی وشرافت کی دلیل ہے، دوسرے تمہاری ولایت میں اضافہ کیا اور یہ تمہارے کاموں کی قدر دانی کا نتیجہ ہے، تیسرے خطاب اور خطوط میں تم کو ایسے لقب سے یاد کرتا ہوں تا کہ اپنے برابر والوں میں تمہارا مرتبہ بلند ہو۔

فائق اور ابوالحسن سیجوری کی ان خوبیوں کے باوجود ان کا سلوک اپنے محسنوں کے ساتھ نہایت ناروا رہا، اور ان ہی کی سازشوں کے نتیجہ میں سامانی حکومت کا بہت جلد زوال ہوگیا۔

ابن الفوطی نے فائق کے باپ کا نام عبداللہ[3] الرومی لکھا ہے، اس سے باپ اور بیٹے

---

[1] ص ۱۶۲ [2] زین الاخبار ص ۱۶۵، یہی ابوالحسن سیجوری کو جب عبدالملک بن نوح نے ۳۴۷ھ میں خراسان کا سپہ سالار مقرر کیا تو اس نے نیشاپور میں ایسے ظلم کیے کہ امیر نے اس کو علٰحدہ کر دیا تھا (زین الاخبار ص ۱۶۰) [3] مجمع الآداب جز ۴ قسم دوم ص ۹۳۵۔

کی وطنی نسبت معلوم ہوئی، البتہ ڈاکٹر جعفر شعار نے ترجمۂ تاریخ یمینی کے حاشیے (ص ۱۵۴) میں لکھا ہے کہ اس کا تعلق حبشہ سے تھا، لیکن یہ ابن الفوطی کی روایت اس کے عین متضاد ہے، حبشہ کے لوگ کالے اور روم کے لوگ گورے ہوتے ہیں، چنانچہ فارسی نثر وشعر میں یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ صنعت تضاد کی مثال کے طور پر آتے ہیں۔

عتبی نے تاریخ یمینی[1] میں ابومنصور[2] ثعالبی کا ایک قطعہ درج کیا ہے، جس میں ۳۸۷ھ تا ۳۸۹ھ کے درمیان جو ممتاز لوگ فوت ہوئے ہیں ان کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے، اس میں اکثر کی وفات کو تاریخ کا بڑا سانحہ قرار دیا گیا ہے، لیکن ابوعلی[3] سیجوری اور فائق کے لیے جو اشعار ہیں ان میں ان دونوں کی خامیوں کو نمایاں کیا گیا ہے، سیجوری کے لیے یہ دو بیت لکھی ہیں : ؎

وکان علا فی الارض یخبطہا ابو   علیّ الی ان طوّحتہ الطوائح

فعارضہ نابٌ من الشرّ اعصل   وعنّ لہ طیرٌ من الشؤم بارح

(اور ابوعلی زمین پر اندھا ہو کر چلتا تھا، یہاں تک کہ زمانہ کی بلاؤں میں وہ گرفتار ہوگیا مصیبت اور بلا نے اپنے کج دندان اس میں گڑو دیے، اور نامبارک پرندہ اس پر ظاہر ہوا)

فائق کے لیے یہ بیت ملتی ہے :

وفائق المجبوب قد جُبَّ عمرہ   فقاظ ولم ینذ بہ فی الارض نائح

(اور فائق جو مقطوع النسل تھا، اس کی عمر کا رشتہ کٹ گیا اور وہ مرگیا، اور روئے زمین پر

---

[1] ص ۱۵۲ تا ۱۵۵، اس موضوع پر ملاحظہ ہو راقم کا مضمون شامل ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مجلد مطبوعہ کراچی [2] فوت ۴۲۹ھ [3] اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

کوئی اس پر نوحہ کرنے والا نہ تھا)

اس بیت کے ترجمہ کے ساتھ ڈاکٹر جعفر شعار نے توسین میں یہ عبارت بڑھائی ہے (اس لیے کہ وہ اہل حبشہ میں سے تھا، اور اس کے علاوہ اس کے کوئی عزیز یا بیٹے نہ تھے) لفظ مجبوب" سے جس کے معنی پشت بریدہ[1] ہیں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی؛

لیکن اس سے مزید دوسرا نتیجہ نکالنا کہ اس کے عزیزوں میں کوئی باقی نہ تھا جو اس کی وفات پر ماتم کرتا میرے نزدیک بغیر کسی مزید شہادت کے صحیح نہ ہوگا، ایسا گمان ہو سکتا ہے کہ اس کے کوئی بیٹا ہوگا جس کی وجہ سے فائق کی کنیت ابوالحسن ملتی ہے، ممکن ہے اس کا نام حسن ہو، اور وہ فوت ہو چکا ہو، اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سیاسی اعتبار سے فائق کا رول کتنا ہی خراب ہو، عالم کی حیثیت سے وہ مرجع علماء و فضلاء رہا تھا، اور اس پر جب کوئی آفت آئی تو ماوراء النہر کے اہل علم و فضل نے اس کی حمایت کی، اس صورت میں تاریخ یمینی میں منقول ابو منصور ثعالبی کی بیت شاعرانہ تعلی کی مثال سمجھی جانی چاہیے، لیکن اس کی اولاد کے نہ باقی رہنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں۔

تاریخ یمینی اور زین الاخبار فائق کی زندگی کے بعض واقعات کے اہم ماخذ ہیں، بیہقی میں بھی دو تین واقعات کے ضمن میں اس کا نام آیا ہے، تاریخ یمینی میں پہلے پہل فائق کا ذکر اس[2] طرح آتا ہے کہ وہ منصور بن نوح کا مملوک اور تربیت یافتہ تھا، اس کے عہد حکومت میں وہ بڑے درجے پر فائز رہ چکا ہے، اور مجمع الآداب[3] کی یہ روایت کہ فائق چالیس[4] سال سے اوپر خراسان کے اکثر شہروں کا والی رہ چکا تھا، اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ منصور کے اوائل عہد ہی میں

[1] دیکھیے دستور الاخوان ص ۵۵۰ [2] ترجمہ ص ۱۴۱ و دراں حضرت بمقامات مذکورہ و مواقف مشہور اختصاص یافتہ۔ [3] جز ۴ قسم دوم ص ۹۳۵ [4] لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ صرف ہرات کا والی (بقیہ ص ۹۳ پر)

کسی شہر کا حاکم مقرر ہوا ہو، اور اسی تذکرہ کی اس روایت سے کہ ۳۵۰ھ میں کتب احادیث اس کے لیے املا کی، یا اس نے املا کی، اور یہ کہ اس کا دربار اہل علم کا بڑا مرکز تھا جس میں اہل حدیث روایت کے لیے جمع ہوتے، ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ منصور کے ابتدائی دور میں وہ کسی قدر اہم مرتبہ پر فائز ہو چکا تھا۔

منصور بن نوح کے عہد کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ علماء کے درمیان قرآن مجید کے فارسی ترجمہ میں اختلاف ہوا، بالآخر طے پایا کہ قرآن کا فارسی میں ترجمہ ہو سکتا ہے، اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت کا انتخاب ہوا جو اس کام کے لیے متعین کیے گئے، یہ سارے کام امیر منصور کے مشورہ سے ہوئے، اور اس میں فائق الخاصہ کا خاصا حصہ تھا، ترجمہ و تفسیر طبری کے مقدمہ میں اس کی پوری تفصیل درج ہے، اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ فائق کا تعلق اہل علم کے طبقہ سے تھا۔

فائق اور ابوالحسن سیمجوری | ابوالحسن محمد سیمجوری جس کا نام بعض کتابوں[1] میں ابوالحسین محمد سیمجوری ہے پانچویں سامانی حکمران عبدالملک بن نوح (۳۴۳ھ تا ۳۵۰ھ[2]) کے عہد میں ۳۴۷ھ میں[3] سپہ سالار مقرر ہوا، لیکن اس نے نیشاپور میں بڑا ظلم کیا تھا، اس لیے جمادی الآخر ۳۴۹ھ میں اس کو برطرف[4] کر کے ابو منصور[5] محمد بن عبدالرزاق کو سپہ سالار مقرر کیا تھا، منصور بن نوح کے عہد میں اس کو دوبارہ سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز کیا گیا، ذی الحجہ ۳۵۰ھ میں اس نے عہدہ

(بقیہ ص ۹۲) کچھ عرصہ کے لیے مقرر ہوا، اور نوح کے زمانہ میں وہ حاجب کے عہدہ پر فائز تھا، (ترجمہ ص ۴۱)

[1] مثلاً رک ترجمہ تاریخ یمینی ص ۳۵، ۴۱، ۴۳، ۴۴ - ۴۷، ۵۸، ۶۲، ۶۵ وغیرہ [2] تاریخ بخارا نرشخی میں شوال ۳۵۰ھ درج ہے، (رک، ص ۱۱۵) [3] زین الاخبار ص ۱۶۰ [4] ایضاً [5] یہی وہ امیر ہے جس نے ۳۴۶ھ میں نثری شاہنامے جمع کیے، لیکن اس کا صرف مقدمہ باقی ہے، جو فارسی نثر کا قدیم ترین نمونہ ہے،
(باقی ص ۹۴ پر)

سنبھالا، اور اب کی بار اس نے رعیت سے بڑا حسن سلوک[1] روا رکھا، اور اسی امیر منصور کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، فائق الخاصہ بھی حکومت کے بڑے عہدہ پر فائز ہو چکا تھا، بقول عتبی[2] سیجوری کے ساتھ فائق کو بھی اس کا شریک کار بنایا، اور دونوں کی مشارکت میں ملک نے بڑی ترقی کی، رفتہ رفتہ دونوں میں تعلقات بھی کافی استوار ہوئے، فائق اور سیجوری میں یہ چیز بھی مشترک تھی کہ دونوں اہل علم کے بڑے قدردان تھے، فائق کی قدردانی کی شہادت ابن[3] الفوطی کے بیان سے ملتی ہے، اور ابوالحسن محمد سیجوری کی زین[4] الاخبار سے۔

امیر منصور بن نوح شوال ۳۶۵ھ میں فوت ہوا، اس کے بجائے اس کا بیٹا نوح تخت نشین ہوا، تو اس نے ابوالحسن محمد بن ابراہیم سیجوری سے تو رشتہ کر لیا اور سپہ سالاری کا عہدہ بھی برقرار رکھا، لیکن سارے امور کا اختیار تاش اور فائق کو دیا: "کارہائے[5] خویش بہ فائق الخاصہ و تاش الحاجب سپرد۔" یہ دونوں بعد میں نیشاپور بھیجے گئے، اسی درمیان ابوالحسن سیجوری اور ابوالحسین عتبی سے شدید اختلاف[6] بڑھا، لیکن بالآخر ابوالحسن سیجوری نے عذر خواہی کی،[7] ان ہی ایام میں ۳۷۱ھ میں امیر نوح نے تاش کو خراسان کا سپہ سالار بنا دیا، اور عتبی تاش کی طرف بڑی توجہ رکھتا، اس لیے کہ وہ اس کے باپ[8] کا غلام رہ چکا تھا، تاش اور فائق نیشاپور میں تھے، یہ لوگ مؤید الدولہ کے خلاف اس کے بھائی فخر الدولہ کی مدد کے لیے گرگان پہونچے، اس میں

(بقیہ ص ۹۳) وہ طوس و نیشاپور کا حاکم تھا، پھر سپہ سالار مقرر ہوا، ۳۵۱ھ میں اس کو زہر دے دیا گیا۔ (بیست مقالہ قزوینی ۲-۱۹۔ [1] زین الاخبار ص ۱۶۲، عتبی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فائق بھی اس کا شریک کار تھا، [2] ترجمہ تاریخ یمینی ص ۴۱، [3] جز ۴، قسم ثانی ص ۹۳۵-۹۳۶ [4] ص ۱۶۲، [5] زین الاخبار ص ۱۶۵ [6] تفصیل کے لیے دیکھیے زین الاخبار ص ۱۶۵ [7] ایضاً۔ [8] ایضاً ص ۱۶۶، ترجمہ تاریخ یمینی ص ۴۵ [9] زین الاخبار ص ۱۶۶۔

تاش کو شکست ہوئی، اور اس کی فوج تتر بتر ہو گئی، کہتے ہیں کہ فائق نے نامردی کا ثبوت دیا، تاش اور فخر الدولہ تو جمے رہے، لیکن فائق بھاگ نکلا، بعض کا کہنا ہے کہ فائق مؤید الدولہ[1] سے مل گیا تھا، ابوالحسن سیجوری کو سپہ سالاری سے برطرفی بڑی شاق گذر رہی تھی، وہ اس معاملہ میں عتبی کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا، اور یہ ٹھیک بھی تھا، سیجوری نے فائق کو اپنا ہمراز بنا لیا، پھر دونوں نے مل کر عتبی کے خلاف سازش کی، اور بالآخر وہ قتل کر دیا گیا،[2] یہ واقعہ ۳۷۲ھ میں رونما ہوا، اب تاش اور ابوالحسن کے اختلاف نے اور شدت پکڑی، ادھر فائق اور ابوالحسن میں اتحاد اور بڑھا، ان کے ساتھ ابوالحسن کا بیٹا جو نیشاپور میں تاش کا خلیفہ تھا،[3] وہ بھی مل گیا، اب یہ تینوں تاش کے خلاف اتنے قوی ہو گئے کہ اس کے عمال کو پکڑ کر بڑی رقم وصول[4] کی، عتبی کے قتل کے بعد ابوالحسین محمد مزنی وزیر مقرر ہوا تھا، لیکن ان تینوں سازشیوں کے سامنے وہ بھی بے دست و پا ہو چکا تھا، ان لوگوں نے مزنی کو قید کر دیا، اور قید کی حالت میں وہ مر گیا، یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور امیر خراسان نوح بن منصور محض ایک تماشائی کا رول ادا کر رہا تھا، ساری قوت ان امراء کے ہاتھ میں تھی جو اپنے اقتدار کے بڑھانے کے لیے ایک دوسرے سے دست بگریباں تھے، غرض تاش باوجود اس کے کہ سپہ سالار تھا اس کی قوت کم ہو چکی تھی، اس نے مجبوراً ان تینوں سے صلح کی، مملکت کے چار حصوں کی تقسیم اس طرح عمل میں آئی، نیشاپور تاش کو ملا، بلخ فائق کو، ہرات ابوعلی کو اور بادغیس، کنج رستاق اور قہستان ابوعلی کے باپ ابوالحسن سیجوری[5] کو دیے گئے، اس صلح نامہ کے باوجود بدامنی ختم نہ ہوئی، سازشیں قوت پکڑ رہی تھیں اور سامانی امیر مجبور ہوتا گیا، یہاں تک کہ

[1] ترجمہ تاریخ یمینی ص ۵۲ [2] ابن اثیر ۹/۵ [3] زین الاخبار ص ۱۶۷، دراصل تاش نے ابوعلی سیجوری کو نیشاپور میں اپنا خلیفہ بنا کر غلطی کی، زین الاخبار میں ہے: "و امیر ابوعلی خلیفتی بہ نیشاپور از تاش بخواست، تاش بر او داد و آں خطا بود کہ تاش کرد (ص ۱۶۷) [4] زین الاخبار ص ۱۶۷ [5] ایضاً۔

ربیع الاول ۳۷۶ھ میں تاش معزول[1] کر دیا گیا، اور ابو الحسن دوبارہ سپہ سالار مقرر ہوا، لیکن معزولی کے باوجود وہ لوگ تاش کو مستقل خطرہ کی علامت سمجھتے رہے، تاش نے شعبان ۳۷۷ھ میں فخر الدولہ دیلمی کی مدد سے نیشاپور کا محاصرہ کیا، اور ابو الحسن پر اتنا دباؤ بڑھا کہ وہ نیشاپور چھوڑ کر قہستان بھاگ گیا، پھر اس نے فخر الدولہ کے مخالف ابو الفوارس فنا خسرو سے کمک طلب کی، آخر الذکر نے دو ہزار فوج مدد کے لیے بھیجی، فائق کی بھی کمک پہونچ چکی تھی، جنگ میں تاش کو شکست[2] ہوئی، ایک سال بعد ابو الحسن سیمجوری جو مخالفین کا سرغنہ تھا، فوت[3] ہو گیا، لیکن اس کی وفات کے بعد بھی فائق اور ابو علی کی سیاسی طاقت نہ ٹوٹی، اور وہ سیاسی امور میں پہلے ہی کی طرح ایسے دخیل رہے کہ کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا،

فائق اور ابو علی سیمجوری ابو الحسن سیمجوری کے دونوں بیٹے ابو علی اور ابو القاسم سامانی امرا میں شامل تھے، جب ۳۷۸ھ میں ابو الحسن کی وفات ہوئی تو ابو القاسم نیشاپور میں تھا، اور ابو علی ہرات میں، دشمنوں نے دونوں بھائیوں میں اختلاف ڈالنے کی کوشش کی، ابو القاسم نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا، اس نے باپ کے خزائن ۳۷۹ھ میں اپنے بھائی ابو علی کے پاس[4] ہرات پہونچا دیے اور اس طرح ابو علی آل سیمجور کا رئیس ہوا، اور خراسان کی امارت بھی اس کو ارثاً اور استحقاقاً ملی، اب سب لوگ اس کے مطیع اور فرماں بردار ہو گئے[5]، اسی درمیان نوح بن منصور نے ہرات کی ولایت فائق کے نام کر دی[6]، یہ بات ابو علی کو نہایت بری لگی، وہ فائق کے پاس ہرات گیا اور اس نے فائق کو شرم دلائی کہ باپ کی وفات پر اس کی مملکت پر اگر اغیار دست درازی کرتے

---

[1] زین الاخبار ص ۱۶۷ [2] تاریخ یمینی ص ۱۴، زین الاخبار ص ۱۶۷ [3] تاریخ یمینی ص ۸۵، زین الاخبار ص ۱۶۷ [4] زین الاخبار ص ۱۶۸ [5] تاریخ یمینی ص ۸۵ [6] ایضاً، تفصیل زین الاخبار میں نہیں ہے۔

تو تمہارا فرض تھا کہ اس کی دفاع کرتے، نہ یہ کہ خود اس کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے، بڑی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ ہرات تو فائق کے پاس رہے گا اور نیشاپور ابو علی کے، اور آخر الذکر قائد جیوش بھی رہے گا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ سردار لشکر یا قائد جیوش کو سامانی امیر کے یہاں سے جو خلعت ملتی ہے وہ بجائے ابو علی کے فائق کے پاس بھیجی گئی، ابو علی کو قدرۃً بڑی تشویش ہوئی، اور وہ ہرات کی طرف متوجہ ہوا، فائق ہرات چھوڑ کر مرو الروز چلا گیا، اور وہاں ابو علی کے لشکر کے کچھ افراد قید کر لیے، اور انھیں بخارا بھیج دیا، ابو علی نے مرو سے امیر بخارا نوح بن منصور کو ایک خط لکھا، اور اپنے پرانے حقوق یاد دلائے[1]، امیر بخارا متاثر ہوا اور اس کو عماد الدولہ کے لقب سے سرفراز فرمایا، اور سپہ سالاری کا عہدہ بھی اسے عنایت کیا، رفتہ رفتہ ابو علی نے اپنی قوت اتنی بڑھا لی کہ اس کا لقب "امیر الامرا المؤید من السماء"[3] قرار پایا، اور اب وہ اپنے آقا نوح کو بھی خاطر میں نہ لاتا[4]، ادھر فائق کا تعاقب اس نے نہ چھوڑا، مجبوراً وہ بخارا چلا گیا[5] تو نوح کو برا معلوم ہوا اور اس نے اسے بخارا سے نکال دیا اور اینانج اور بکتوزون کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا، غالباً یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہوگا کہ وہ ابو علی سے خائف ہو چکا تھا، بہر حال فائق بلخ پہونچنے میں کامیاب ہوا، پھر وہاں سے ترمذ گیا اور خان کو خط لکھا،

---

[1] تاریخ یمینی ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۸۶ [3] زین الاخبار ص ۱۶۸ میں ہے کہ یہ لقب خود اس نے اختیار کر لیا تھا، اور تاریخ یمینی میں ہے کہ اس کی قوت اتنی بڑھ چکی تھی کہ لوگوں نے اسے یہ لقب دیا تھا، (ص ۸۷) اس موقع پر ابو بکر خوارزمی اور بدیع ہمدانی نے اس کی مدح میں قصائد لکھے (دیکھیے تاریخ یمینی ص ۸۷-۹۱) [4] زین الاخبار ص ۱۶۸، تاریخ یمینی ص ۹۱ میں ہے کہ امیر نوح نے اس سے استدعا کی کہ خراسان کے بعض علاقے دیوان خاص کے متعلق کر دے مگر اس نے اس کی استدعا رد کر دی، [5] تاریخ یمینی ص ۹۳، زین الاخبار میں فائق کے بخارا جانے کا واقعہ ابو علی کے لقب پانے کے فوراً بعد لکھا ہے، تاریخ یمینی میں کافی بعد کا بیان ہے۔

اور نوح کے خلاف اسے بھڑکایا، نوح نے ابوالحارث فریغونی کو حکم دیا کہ وہ فائق سے لڑے[1]،
ابوالحارث نے بڑی تیاری کی، لیکن فائق کے آخر سالار ارسلان نے فریغونی کو شکست دی،
اور کامیاب ہو کر بلخ واپس ہوا،

اسی درمیان طاہر بن فضل نے چغانیاں کو ابوالمظفر[2] محمد بن احمد بن محتاج چغانی سے
چھین لیا[3]، ابوالمظفر نے فائق سے مدد طلب کی، طاہر کو جب یہ معلوم ہوا تو بلخ پر جو اس وقت
فائق کے پاس تھا حملہ کر دیا، لیکن اس حملہ میں طاہر قتل ہو گیا، ادھر بخارا کے حالات بد سے
بدتر ہو رہے تھے تو امیر بخارا نے فائق کو بخارا طلب کیا، اور اس کی دلجوئی کے لیے سمرقند
اس کے سپرد کیا، اسی درمیان بغراخان[4] نے بخارا پر حملہ کیا، فائق نے فوراً خان کی اطاعت[5] قبول
کر لی، زین الاخبار[6] میں ہے کہ جب ایلک (بغراخان) اسپیجاب آیا تو ابوعلی نے خط لکھ کر بخارا
جانے کی دعوت دی، جب خان ۳۸۲ھ میں بخارا کے قریب پہونچا تو نوح نے ابوعلی کے
پاس قاصد بھیجا اس پیغام کے ساتھ کہ "بیا کہ خان آمد" ابوعلی نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی،
تو نوح نے شہر خالی کر دیا، بغراخان بخارا میں داخل ہوا، فائق نے اس کا زبردست استقبال کیا،
اور اس طرح وہ بغراخان کے خواص میں شامل ہوا، فائق بلخ آیا اور خان کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکہ[7]

---

[1] اس خاندان کے حالات کے لیے دیکھیے تعلیقات چہار مقالہ، مقالہ دوم، از محمد قزوینی [2] اس نام اور
کنیت کا کوئی حکمراں نہیں ملتا، شاید ابوالمظفر عبداللہ بن احمد بن محمد بن مظفر بن محتاج ہو، ترجمہ کے ایک دوسرے
نسخے میں ابوالمظفر احمد بن محمد ہے، دیکھیے ص ۹۴ ح) متن میں محمد بن احمد غلط ہے، زین الاخبار ص ۱۶۸ میں
صرف ابوالمظفر ہے، [3] تاریخ یمینی میں بغراخان اور زین الاخبار میں ابوموسیٰ ہارون بن ایلک خان ہے،
دراصل اس کا پورا نام شہاب الدولہ ظہیر الدعوۃ ہارون بن سلیمان ایلک معروف بہ بغراخان ہے (فرہنگ معین
ج ۵ ص ۲۸۳۔ [4] تاریخ یمینی ص ۹۴ [5] ص ۱۶۸ [6] تاریخ یمینی ص ۹۵۔

جاری کیا، لیکن بغراخان کو بخارا کی آب و ہوا راس نہ آئی، وہ لوٹ گیا، اور راستے میں اس کا انتقال
ہو گیا، نوح کو جب اس کی خبر لگی تو بخارا پر حملہ کر کے اسے دوبارہ اپنے قبضہ میں کر لیا، فائق نے
جب یہ حال دیکھا تو نوح سے مقابلہ کے لیے بخارا آ گیا، لیکن اس مہم میں اس کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا،
اس کے ساتھی بڑی تعداد میں قتل ہوئے[1]، آخر کار وہ تھوڑی سی فوج کے ساتھ واپس لوٹا، پہلے
وہ مرو کی طرف متوجہ ہوا، اور اپنے پرانے ساتھی ابوعلی سیمجوری سے امداد[2] کی درخواست کی، اگرچہ
ابوعلی اور فائق کے مابین کشمکش جاری تھی، لیکن اس نے نوح کے مقابلہ میں فائق کو ساز و سامان سے
آراستہ کیا، پھر دونوں نیشاپور آئے، نوح کو جب اس کی اطلاع ملی تو امیر ناصر الدین سبکتگین سے
امداد طلب[3] کی، ابوالحارث فریغونی اور شار بھی نوح کی مدد پر آمادہ ہو گئے، ابوعلی نے فخر الدولہ[4] دیلمی
سے کمک طلب کی، اور یہ لوگ فائق کے ساتھ نیشاپور سے متحدہ افواج کے مقابلہ[5] کے لیے
آگے بڑھے، لیکن ابوعلی نے جنگ پر صلح کو ترجیح دینی چاہی، اس غرض سے سبکتگین کے توسط سے
صلح کا پیغام بھیجا، لیکن اس کے نوجوان اور پُرجوش ساتھی صلح پر رضامند نہ ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ
گھمسان کی جنگ ہوئی، اس میں ابوعلی اور فائق کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا، تاریخ یمینی سے معلوم
ہوا کہ دارا[6] ابن شمس المعالی نے دغا کی، وہ فائق اور ابوعلی کے لشکر سے عین اس وقت جب جنگ
جاری تھی نکل کر سامانی لشکر میں شامل ہو گیا، ورنہ فائق نے دشمن کے میسرہ کو اور ابوالقاسم سیمجوری
نے میمنہ کو توڑ دیا تھا، قلب لشکر میں دارا تھا، اسی موقع پر اس نے غداری کی، غرض فائق اور ابوعلی[7]
ناکام لوٹے، اب ان دونوں نے جرجان کی طرف رخ کیا، اس اعتماد پر کہ فخر الدولہ ان کی مدد کریگا،
وہاں سرما اور بہار گذارا، آخر میں فخر الدولہ نے فوجی کمک دینے[8] سے انکار کیا، جرجان سے

---

[1] تاریخ یمینی ص ۱۰۰ [2] ایضاً ص ۱۰۱ [3] ایضاً ص ۱۰۲ [4] ایضاً ص ۱۰۳ [5] ایضاً ص ۱۰۵ [6] ایضاً
ص ۱۰۷ [7] ایضاً ص ۱۰۷ [8] ایضاً ص ۱۱۱۔

ناامید ہو کر اس نے نیشاپور کی طرف متوجہ ہونے کا خیال کیا، یہاں سلطان محمود تنہا تھا، انکے نزدیک اس کو شکست دینا آسان ہوگا، سب لوگوں کو یہ رائے پسند آئی، خصوصًا اس وجہ سے بھی کہ گرگان کا گرمی کا موسم بہت خطرناک قسم کا ہوتا تھا[1]، ابوعلی کا دستہ جوین کی راہ سے اور فائق کا اسفرائن کی طرف سے اس مہم پر روانہ ہوا، جب سیف الدولہ محمود کو اس کی اطلاع ملی تو وہ گھبرا گیا، اور وہاں سے بھاگ نکلا[2]، اس کے ساز و سامان پر فائق اور ابوعلی کا قبضہ ہوگیا، یہ واقعہ ۳۸۵ھ[3] کا ہے، جب محمود نے اپنے باپ ناصر الدین سبکتگین کو سارے واقعات کی اطلاع پہونچائی تو آخر الذکر نے ایک بڑی فوج تیار کی، اور فائق اور ابوعلی کے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا، فائق اب طوس پہونچ چکا تھا، اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سبکتگین سے لڑنے کے بجائے صلح کرنا بہتر ہوگا، فائق نے ایک خط سبکتگین کے پاس بھیجا جس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور اسکی اطاعت کیلئے آمادہ ہے اس طرح وہ ابوعلی سے رشتہ توڑنا چاہتا تھا، ابوعلی کا ایک ساتھی امیرک طوسی تھا وہ بھی ناصر الدین کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا، سیجوری نے جب یہ حال دیکھا تو ابوالقاسم فقیہ کو درمیان میں ڈال کر فائق اور امیرک کی غلط فہمی رفع کردی اور اب دونوں ابوعلی کے ہمرکاب دشمن سے لڑنے کے لیے آمادہ ہوگئے، لیکن اس کا خود اپنا بھائی ابوالقاسم سیجوری ابوعلی کا ساتھ دینے سے اس بنا پر انکار کر رہا تھا کہ بھائی نے ولایت ہرات اس سے نکال کر اپنے غلام ایلمنکو کو دے دی تھی[4]، ادھر ناصر الدین پوری تیاری کے ساتھ آگے بڑھا، دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے، گھمسان کی جنگ شروع ہوئی، اتنے میں سیف الدولہ نے پیچھے سے حملہ کردیا، اب ابوعلی اور اس کے ساتھی درمیان میں آگئے، اور ان کے لیے راہ فرار مسدود ہوگئی، ان کے لشکر کے ہزار ہا آدمی مارے گئے، البتہ فائق اور ابوعلی بچ بچا کر

---

[1] تاریخ یمینی ص ۱۱۳ [2] ایضاً ص ۱۱۶ [3] تاریخ بیہقی ص ۲۰۵ [4] تاریخ یمینی ص ۱۱۹

قلعۂ کلات پہونچے، پھر ابیورد گئے[1]، فائق اس جنگ سے خستہ تھا، اور اس نے ابوعلی سے علٰحدگی اختیار کرنے کی سوچی، اور اس کے مشورہ کے بغیر سرخس کی طرف متوجہ ہونے کا قصد کیا، ابوعلی کو جب اس کے ارادے کی خبر لگی تو متفکر ہوا، اور منت سماجت کرکے اس کی بدگمانی دور کی، پھر دونوں ساتھ ساتھ سرخس پہونچے اور وہاں سے مرو آئے، ناصر الدین ان کا تعاقب کر رہا تھا، جب یہ آل شط پہونچے تو دونوں نے اپنے اپنے سفیر امیر نوح کے پاس بخارا بھیجے، فائق نے عبدالرحمٰن فقیہ کو اور ابوعلی نے ابوالحسین کثیر کو اپنا قاصد مقرر کیا تھا، اور ان کے واسطے سے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی اپنی تقصیرات کی معافی چاہی تھی، ترجمۂ تاریخ یمینی میں یہ باتیں نہایت بلیغ انداز میں بیان[2] ہوئی ہیں، اس سلسلہ کی ایک مختصر عبارت نقل کی جاتی ہے:

"پوشیدہ نیست کہ ابوعلی و فائق دو بندۂ حضرت اند، و اگرچہ سمت عصیان دارند و در کفران نعمت قدمہا گذاردہ[3] اند و خاطر منور ملک را آزردہ، جائے خویش بدیدند و سزائے خود یافتند و قدر نعمت رضائے ملک بشناختند، و بندگان قدیم و خدمتگاران موروث بر مثال کبوتران سرائے باشند کہ اگرچہ در فضائے ہوا پرواز کنند و گرد جہان برآیند عاقبت بہ مسکن قدیم گرایند و سر با نشیمن معہود نہند، و اینک بر آن امل رحمت و رافت ملک نشستہ اند و با تیغ و کفن بہ زنہار آمدہ و می گویند: اگرچہ گناہ ما بسیار است، کرم ملک بیش است، و اگرچہ مجال عذر ما تنگ است، عرصۂ ہمت و منت پادشاہ فراخ است، سزد

---

[1] تاریخ یمینی ص ۱۲۲-۱۲۳۔ [2] ص ۱۲۵-۱۲۶ [3] مرتب نے متن میں "گزاردہ" اور حاشیہ میں "گذاردہ" لکھا ہے، یہ صحیح نہیں، گزاردن بمعنی پیش کرنا، اس سے "گزارش" اسم مصدر ہے، اور گذاردن = گذاشتن بمعنی ڈالنا، چھوڑنا، قدم گذاشتن: قدم کا نشان ڈالنا، چھوڑنا، بنیاد گذاشتن: بنیاد ڈالنا، اس بنا پر واضح ہے کہ متن میں قدم گذاردہ ہونا چاہیے جیسا کہ کسی نسخہ میں ہے، ص ۱۸۱ پر بھی مرتب نے گذاردہ پر گزاردہ کو ترجیح دی ہے، جو صحیح نہیں،

کہ از آنجا کہ محتد کرم و عنصر پاک اوست کرامت لاتثریب علیکم الیوم[1] ارزانی دارد
و از سر ہفوات و فرطات ما برخیزد و باسر رحمت و عاطفت آید، تا بندگان سرگشتہ باسر رشتۂ
خدمت آیند و تقصیر ہائے گذشتہ را بخدمات پسندیدہ تدارک کنند۔

(اور یہ بات چھپی نہیں کہ ابوعلی اور فائق اس درگاہ کے دو غلام ہیں، اور اگرچہ ان کا دامن آلودۂ عصیان ہے، اور انھوں نے کفران نعمت کا ارتکاب کیا ہے، اور بادشاہ کے دل منور کو آزردہ کیا ہے تو انھوں نے اس کا انجام دیکھا، اپنی سزا پائی اور اب انھوں نے ملک کی خوشنودی کی نعمت کی قدر پہچانی، قدیم غلام اور موروثی خدمتگار پالتو کبوتروں کے مانند ہیں کہ وہ فضا میں پرواز کرتے ہیں اور ساری دنیا میں اڑا پھرا کرتے ہیں، بالآخر اپنے پرانے نشیمن پر لوٹتے ہیں، اور ان ہی میں اپنا سر چھپاتے ہیں، اب تو یہ دونوں شط آمل پر حضور کی رحمت اور شفقت کے بھروسے پر بیٹھے ہیں، اور تیغ و کفن کے ساتھ پناہ کے لیے آگئے ہیں اور اقرار کرتے ہیں اگرچہ ہمارا قصور بہت زیادہ ہے، لیکن بادشاہ کا کرم اس سے بھی زیادہ ہے، اور اگرچہ ہماری معافی کے لیے عذر کا موقع کم ہے لیکن بادشاہ کی مروت اور حوصلہ اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اور اس بنا پر کہ آپ کی طبیعت کریمانہ اور آپ کی ذات پاک ہے امید ہے کہ (آیۂ قرآنی) "آج کے دن تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے" کی کرامت ہمارے حق میں عمل میں آئے گی، اور ہماری لغزشوں اور خطاؤں کو درگذر کیا جائے گا، اور رحمت اور مہربانی کا برتاؤ ہمارے ساتھ ہوگا، تاکہ بھٹکے ہوئے خدمت کے رشتہ میں جڑیں اور اپنی پرانی کوتاہیوں کا تدارک اپنے حسن عمل سے کریں)

لیکن اس کے باوجود امیر نوح نے فائق کے قاصد کو گرفتار کرلیا، اور ابوعلی کے سفیر پر

---

[1] قرآن سورہ ۱۲، آیت ۹۲، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کے سلسلہ میں یہی آیت تلاوت فرمائی تھی ورنہ اصل یہ آیت حضرت یوسفؑ کے اپنے بھائیوں کے قصوروں کی معافی کے موقع کی ہے۔

عنایت کی، اور اس کے ذریعہ ابوعلی کو یہ پیغام بھیجا کہ اسے جرجانیہ[1] جانا چاہیے، امیر کے اس برتاؤ سے فائق کو بڑا صدمہ ہوا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ[2] جیحون پار کر کے ایلک[3] کی خدمت میں چلا جائیگا اور اس کے خدم و حشم میں شامل ہوگا، اس نے ابوعلی سے کہا کہ تم کو جرجانیہ بھیجنے میں کوئی راز ہے تمھیں جرجانیہ نہیں جانا چاہیے، مگر ابوعلی نہ مانا، اس نے فائق کا ساتھ چھوڑ دیا، فائق نے جیحون پار کیا، اور ایلک کی خدمت میں باریابی[4] حاصل کی، ایلک نے اس کے ساتھ بڑی تعظیم و تکریم کا برتاؤ کیا، ابوعلی کا فیصلہ صحیح نہ تھا، بہر حال وہ جرجانیہ جانے لگا تو ہزار اسپ کے قریب رمضان ۳۸۶ھ میں ابوعبداللہ خوارزم شاہ نے اسے گرفتار کرلیا، جب اس واقعہ کی اطلاع مامون بن محمد والی جرجانیہ کو ملی تو اس نے خوارزم شاہ پر حملہ کر کے اسے قید کرلیا، اور ابوعلی کو آزاد کرایا، اور بڑے احترام کا سلوک کیا[5]، اور امیر نوح سے اس کی خطاؤں کی معافی کی درخواست کی، امیر نے اس کو مع دوسرے سرداروں کے بخارا طلب کیا، چنانچہ یہ بخارا پہونچے تو انھیں گرفتار کرلیا گیا[6]، سبکتگین اس وقت مرو میں مقیم تھا، ایلک خان کی یورش کا حال سنا، فوراً بلخ آیا اور امیر نوح سے خط و کتابت شروع ہوئی، اس وقت اس نے یہ بھی درخواست کی کہ ابوعلی کو مع اس کے سرداروں[7] کے اس کے

---

[1] ترجمۂ تاریخ یمینی ص ۱۲۵، زین الاخبار میں ہے کہ ابوعلی نیشاپور چلا گیا تو سیف الدولہ محمود نے اسے قید کرلیا، لیکن وہ کسی طرح نکل بھاگا اور خوارزم جاتے ہوئے خوارزم شاہ نے اسے گرفتار کرلیا (ص ۱۷۱) [2] ترجمۂ تاریخ یمینی ص ۱۲۵ [3] ایلک خان شمس الدولہ ابونصر احمد بن علی، آل افراسیاب کا چوتھا حکمراں ۳۸۲ھ میں تخت نشین ہوا ۴۰۳ھ میں وفات پائی (ابن اثیر ۹/۶۲) [4] ترجمۂ تاریخ ص ۱۲۷، امیر بخارا نے اس کے تعاقب میں بکتوزون کو روانہ کیا تھا، لیکن دونوں میں جنگ نہیں ہوئی [5] ایضاً ص ۱۳۰ نیز دیکھیے زین الاخبار ص ۱۷۱ [6] زین الاخبار ص ۱۷۱ میں ہے کہ اس کو اٹھارہ سرداروں کے ساتھ قلعۂ قہندز میں قید کر دیا [7] گردیزی لکھتا ہے کہ شعبان ۳۸۶ھ میں ابوعلی، اس کا غلام ایلمنکو، امیرک طوسی اور ابوالحسین پسر ابوعلی، چار نفر سبکتگین کے پاس بھیجے گئے تھے۔ (زین الاخبار ص ۱۷۱)

پاس بھیج دیا جائے، امیر نوح نے ان سب کو سبکتگین کے پاس بھیجا، اور اس کے حکم[1] سے سب کے سب قلعہ گردیز میں ڈال دیے گئے، اسی قلعہ میں[2] ۳۸۷ھ میں ابو علی اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا[3]، اس طرح سیجوری خاندان کے اس نامور سردار کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

فائق اور ایلک خان اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فائق کا بغراخان کے بخارا بلانے میں ہاتھ تھا، چنانچہ اس نے ربیع الاول ۳۸۲ھ میں بخارا کو فتح کیا، لیکن یہاں کی آب و ہوا اس کو راس نہ آئی اور وہ اسے چھوڑ کر واپس چلا، راستے ہی میں اس کا[4] انتقال ہو گیا، اس وقت فائق بلخ میں تھا، اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اس نے امیر نوح سے جنگ کی اور شکست کھائی، پھر ابو علی کا ساتھ ہوا تو دونوں عرصہ تک ساتھ رہے، آخر میں ابو علی کا خوارزم کا واقعہ پیش آیا، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، فائق ابو علی سے رخصت ہو کر ایلک[5] خان کے پاس پہونچ گیا، ایلک خان جس کا پورا نام شمس الدولہ ابو نصر احمد بن علی ہے بغراخان کا جانشین تھا، اس نے فائق الخاصہ[6] کا استقبال کیا اور آخر الذکر کے مشورہ اور ایماء سے امیر نوح بن منصور سے نمٹنے کے لیے ماوراء النہر پر پوری قوت سے لشکر کشی کا ارادہ کیا، تو نوح بن منصور نے اس واقعہ کی اطلاع سبکتگین[7] کو دی، سبکتگین نے ایک بڑا لشکر مقابلہ کے لیے تیار کیا، اور سیف الدولہ محمود کو نیشاپور[8] سے طلب کیا، جب اس کی تیاری کی خبر ایلک خان کو لگی تو اس نے ناصر الدین سبکتگین کو لکھا کہ امیر نوح جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا ہے اور اسلامی اصولوں پر حکمرانی کے بجائے لہو و لعب میں مشغول رہتا ہے، اس کو ہٹانا چاہیے، اور اس خطے کی

---

[1] گردیزی نے چارقی اد لکھی ہے، [2] زین الاخبار ص ۱۷۱ میں ۳۸۹ھ ہے جو غلط ہے [3] زین الاخبار ایضاً [4] زین الاخبار ص ۱۶۸ [5] دیکھیے زین الاخبار حاشیہ ص ۱۷۳، جہاں ابن اثیر کے حوالہ سے اس کا نام اور تاریخ جلوس لکھی ہے۔ [6] ترجمہ تاریخ یمینی ص ۱۲۷ [7] ترجمہ تاریخ یمینی ص ۱۳۳۔

آمدنی کو اسلامی کاموں میں صرف[1] کرنا چاہیے، ناصر الدین نے اس خط کا سخت جواب دیا کہ "نوح بڑا بادشاہ[2] ہے، اور اس کے اجداد کا تمام مسلمانوں پر بڑا احسان ہے، اس خاندان کے پروردگان نے بغاوت کر کے حق شناسی کو پامال کر ڈالا ہے (واضحًا اس میں اشارہ فائق اور ابو علی کی طرف رہا ہوگا) میں نے اس سے عہد کر رکھا ہے کہ جب بھی اس خاندان پر مصیبت آئے گی میں اس کے دفع کرنے میں پوری قوت صرف کروں گا۔"

ایلک خان نے جب یہ جواب سنا تو جنگ کرنے کے لیے مستعد[3] ہو گیا، اسی درمیان ابو علی کا واقعہ پیش آیا، قید ہوا اور پھر قتل، لیکن جب وہ ترکستانی قبائل کے ساتھ بخارا پہونچا، تو ناصر الدین کے پاس سفیر بھیج کر صلح کی پیش کش کی، چنانچہ صلح ہو گئی، اور طے پایا کہ ایلک خان اور نوح دونوں کی مملکت کے درمیان ایک سد ہوگا، دونوں میں سے کوئی اس سد کو نہ توڑے گا، ایلک خان کی سفارش پر فائق کو سمرقند کا علاقہ بطور حق الخدمت دیا گیا، واضح ہے کہ اس ساری کشمکش میں فائق کا ہاتھ تھا، وہ ایلک خان کو ابھار کر لایا تھا، اور اس کی معیت میں تھا، مگر فریقین میں جنگ نہ ہوئی، پھر بھی فائق کو اس کے حق الخدمت کے طور پر سمرقند کا علاقہ مل ہی گیا[4]، ایلک اور نوح کے مابین جو قرارداد طے پائی وہ ائمہ و مشائخ ماوراء النہر کی گواہیوں[5] سے مزین تھی۔

فائق اور ابو الحارث منصور بن نوح امیر نوح بن منصور ۱۳ رجب ۳۸۷ھ کو فوت ہوا، اس کی

---

[1] چند جملے ملاحظہ ہوں: نوح ارتفاعات خراسان و ماوراء النہر بر معازف و ملاہی و ملاذ و شہوات صرف می کند نہ اسلام را نہ ومددے دہد در حفظ ثغرے از و معاونتے، لایق تر آنکہ ایں ولایت را ازو خالی کنیم و ابواب المال آں بر اعوان دین و انصار اسلام .... مصرف داریم الخ [2] ملک نوح پادشاہ بزرگوار است و اسلاف او در ایہ کافۂ اہل اسلام حقوق فراواں ... چوں موالی و خدم او بر او بغی کردند و راہ عناد پیش گرفتند الخ [3] ایضاً ص ۱۳۴ [4] ایضاً ص ۱۳۹ [5] ترجمہ تاریخ یمینی ص ۱۳۹۔

وفات پر اس کا نابالغ بیٹا ابوالحارث منصور بن نوح تخت نشین ہوا، تو وزارت کے عہدہ پر ابوالمظفر برغشی کو مقرر کیا اور دوسرے سارے کاموں کی ذمہ داری[1] فائق الخاصہ کے سر پڑ ڈالی گئی، اسی درمیان عبدالعزیز نے ابومنصور اسپیجابی کو ورغلایا کہ اس کو خراسان کی سپہ سالاری مل سکتی ہے، اس معاملہ میں ایلک خان سے بھی استعانت کی ضرورت ہوگی، ایلک ان کی مدد کی خاطر روانہ ہوا، اور سمرقند تک آیا، ابومنصور نے اس کا استقبال کیا، لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ایلک نے ابومنصور عزیز اور اسپیجابی دونوں کو گرفتار کر لیا، فائق ان دنوں سمرقند میں تھا، ایلک نے اس کو بلایا، اور جیسے ہی وہ دربار میں پہونچا تو ایلک نے اس کا خیر مقدم کھڑے ہو کر کیا اور تین ہزار سوار اس کے ساتھ کیے اور بطور مقدمہ اس کو بخارا کی طرف بھیجا، جب ابوالحارث منصور کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ بہت متحیر ہوا، اور ارکان دولت کو لے کر جیحون پار کر گیا، جب فائق بخارا پہونچا، تختِ سلطنت خالی دیکھا، پھر بھی تخت کے سامنے گیا اور زمین کو بوسہ دیا، اور حجاب کی جگہ بیٹھ گیا اور بہت رویا، مشائخ بخارا کو اس کے پیچھے روانہ کیا اور اس کو واپس آنے کی درخواست بڑی منت و سماجت کے ساتھ کی اور اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا، ابوالحارث نے اس بات کا یقین کیا، اور فائق کے قول و قرار پر اعتماد کیا، پھر ایک حکم نامہ صادر کیا جو فائق کی مساعی کے تشکر اور اس کی خدمت و طاعت کے وعدے پر اظہار خوشی پر مشتمل تھا، اس حکم نامہ کے ابتدائی کلمات اس طرح کے تھے: "اے فائق! خدا تمھیں ولایت عطا کرے، جو شخص اخلاص کو پیشوا بناتا ہے تاکہ وہ اس کو ہدایت کرے اور خیر خواہی کو لگام بناتا ہے تاکہ وہ اس کی مدد کرے، پس اس شخص کو اس جگہ ٹھہر جانا بہتر ہے جہاں اخلاص اس کو روک دے، اور جس جگہ سے خیر خواہی اس کو واپس کر دے،

---

[1] ترجمہ تاریخ یمینی ص ۱۵۶ : وزمام امور وکفالت جمہور بہ فائق تفویض کرد، زین الاخبار ص ۱۷۱، و دیگر کارہا بہ فائق ہمی راند. یعنی سپہ سالار بھی وہی او رحاجب بھی وہی تھا۔

اس کا واپس ہو جانا پسندیدہ ہے۔"

ابوالحارث اس صورت حال سے بڑا مطمئن تھا، بکتوزون حاجب بزرگ سپہ سالار لشکر بنا کر نیشاپور بھیج دیا گیا اور اسے سنان الدولہ کا لقب بھی عنایت کیا گیا، اور امیر خود بخارا آیا، فائق نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس طرح آتش فتنہ خاموش ہوئی، فائق اور بکتوزون میں عرصہ سے مخالفت چلی جا رہی تھی، امیر نے کوشش کر کے دونوں میں صلح کرا دی، فائق نے مضیٰ ما مضیٰ پر عمل کیا، اور ایک دوسرے سے عہد و پیمان ہوئے، بکتوزون کی سپہ سالاری کو اس نے منظور کیا، لیکن خراسان کے معاملات دیوان سلطنت کے لیے حاصل کیے، خراسان کا حکم بغیر کسی تعرض و تنازع کے اپنے لیے محفوظ کر لیا، اس کے نتیجہ میں اس کے دماغ میں فتنہ جاگزین ہو گیا، اور اپنے محسن کے ساتھ بدعہدی کا خیال اس کے دل میں جم گیا۔

فائق اور ابوالقاسم سیمجوری ابوعلی کے خاتمہ کے بعد اس کا بھائی ابوالقاسم سیمجوری تنہا ہو گیا، اسی درمیان آل سیمجور[1] کے پرانے دوست فخرالدولہ دیلمی کا بھی انتقال ہو گیا، ابوالقاسم اس کے بیٹے مجدالدولہ ابوالقاسم کے پاس جرجان چلا گیا، اس کی وجہ سے سیمجوریوں کے وابستگان جرجان پہونچ رہے تھے، یہاں تک کہ اس کے پاس ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا، فائق تو زندگی بھر سیمجوریوں کے ساتھ ساتھ رہا، ابوالقاسم کے باپ ابوالحسین محمد سے ان کے گہرے روابط تھے اور اس کی وفات کے بعد ابوعلی سیمجوریوں کا سرگروہ ہوا تو مدت تک فائق اور ابوعلی ایک ساتھ ہو کر اپنے مخالفین کا مقابلہ کرتے رہے، ابوعلی کے بعد تو صرف ابوالقاسم رہ گیا تھا، فائق سمرقند اور بخارا رہتا، لیکن وہ ابوالقاسم کو بکتوزون کے خلاف خط بھیجتا رہتا اور اس کو اس بات پر آمادہ کرتا کہ بکتوزون پر حملہ کر دے، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے ابوالحارث نے

---

[1] دیکھیے ترجمہ تاریخ یمینی ص ۱۶۵ بعد۔

ان دو[1] شاطروں کے درمیان مصالحت کرادی تھی، لیکن ان کے دل سے کینہ ختم نہیں ہوا تھا، بہرحال ایک طرف تو فائق کے خطوط اور دوسری طرف ابوالقاسم کے دل میں خراسان کی سپہ سالاری کے چھن جانے کی کسک، بہرحال ابوالقاسم نے بکتوزون کے خلاف فوج کشی کا ارادہ مستحکم کرلیا، بکتوزون کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے مصالحت کا پیغام بھیجا، لیکن بے سود، ابوالقاسم نے نیشاپور پر حملہ کردیا، لیکن بکتوزون نے اس کو شکست فاش دی اور اس کے ساتھی گرفتار ہوگئے، یہ واقعہ ربیع الاول ۳۸۸ھ کا ہے، ابوالقاسم اپنی موروثی اقطاع قہستان چلا گیا، فائق اس واقعہ سے بڑا رنجیدہ ہوا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ فائق نے نہ ابوالقاسم کا ساتھ دیا اور نہ بکتوزون کا، ابوالقاسم نے قہستان سے بوشنج کی طرف رخ کیا تو بکتوزون اس کی طرف متوجہ ہوا کہ بوشنج کو اسکے قبضہ سے نکالے، ابوالقاسم نے خیال کیا کہ اس سے مقابلہ نہ ہوسکے گا تو اپنے بیٹے ابوسہل کو بکتوزون کے پاس گرو[1] رکھا، اور اس سے اپنا پیچھا چھڑایا، یہ مصالحت رجب ۳۸۸ھ میں ہوئی،

اس وقت خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ عجب انتشار کا شکار تھا، سبکتگین والی غزنہ اور نوح بن منصور والی ماوراء النہر کا انتقال ایک ہی سال یعنی ۳۸۷ھ میں ہوا، سبکتگین کا وارث محمود ہوا، اور نوح کا ابوالحارث منصور بن نوح، محمود نے بڑے تدبر سے اپنی مخالفت ختم کرلی لیکن ابوالحارث کے یہاں سخت انتشار رہا، وہ تقریباً ۱۹ ماہ حکمراں رہا، اس درمیان کم از کم چار وزیر بدلے، پہلے ابو[2] المظفر وزیر ہوا، پھر ابوالقاسم[3] برمکی، پھر ابوالحسین حمولی[4]، اور آخر میں

[1] ترجمہ میں ہے: ابوسہل را بہ نوا بہ بکتوزون داد (ص ۱۶۶)؛ نوا اور گروگان رہن رکھنے کے معنی میں آتے ہیں، دیکھیے برہان قاطع ج ۴ ذیل نوا و حاشیہ از معین۔ [2] زین الاخبار ص ۱۷۱، ۳۸۸ھ میں وزارت سے معزول ہوا۔
[3] ایضاً ص ۱۷۲، اس کا پورا نام ابوالقاسم العباس بن محمد برمکی تھا، [4] ابوالحسین بن محمد بن علی حمولی محمود غزنوی کی طرف سے بخارا سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا، وہاں وہ وزیر بنا دیا گیا، ترجمہ یمینی ص ۱۷۰، نیز زین الاخبار ص ۱۷۲۔

ابوالفضل[1] خنامتی، دراصل ابوالحارث کے وابستگان میں دو[2] بڑے فتنہ پرداز برسر اقتدار تھے، ایک فائق اور دوسرے بکتوزون، اور ان دونوں میں آپس میں سخت اختلاف تھا، جس کو وقتی طور پر ابوالحارث نے دباؤ ڈال کر ختم کردیا تھا، فائق بخارا میں بیٹھا طرح طرح کی سازشیں کررہا تھا، بکتوزون ابوالقاسم سیمجوری سے برسر پیکار تھا، بکتوزون سیمجوری سے نمٹ چکا اور رجب ۳۸۸ھ میں دونوں میں مصالحت ہوگئی، فائق اور ابوالمظفر برغشی وزیر کے درمیان اختلاف زور پکڑ گیا تھا، فائق کے خوف سے وزیر نے امیر بخارا کے محل میں پناہ لی اور امیر ابوالحارث کی براہ راست پناہ میں آگیا، فائق نے اس کا مطالبہ سختی سے کیا، امیر نے اس کو سخت جواب دیا، فائق کو بہت گراں گذرا اور بخارا چھوڑنے کا اس نے فیصلہ کیا، مشائخ بخارا بیچ میں پڑے اور امیر اور فائق کے اختلاف کو ختم کرایا، بہرحال یہ طے پایا کہ ابوالمظفر جوزجان چلا جائے، اور ابوالقاسم برمکی کو وزارت سونپی گئی۔[3]

امیر سیف الدولہ محمود نے ابوالحارث کے باپ نوح بن منصور کی وفات پر ابوالحارث کو جو تعزیتی خط[4] لکھا اس میں دونوں خاندانوں کے قدیمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہر طرح کے تعاون کا اظہار کیا، البتہ اس کے ساتھ یہ اشارہ تھا کہ بکتوزون کو نیشاپور کی سپہ سالاری سے معزول کردیا جائے، ابوالحارث نے اس سے انکار کیا تو محمود نے ابوالحسن حمولی کے ذریعہ منصور کو یہ پیغام بھیجا کہ ہم دونوں میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، حمولی بخارا پہونچا تو یہاں کی وزارت خالی تھی، منصور نے اس کو اپنا وزیر بنالیا،[5] اس خبر سے محمود ناراض ہوا، اور منصور کی بدعقلی پر ان باتوں کو محمول کیا اور نیشاپور کی طرف رخ کیا،

[1] ابوالفضل محمد بن احمد خنامتی کے لیے دیکھیے زین الاخبار ص ۱۷۲ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے ترجمہ تاریخ یمینی ص ۱۶۸ [3] ایضاً ص ۱۶۹-۱۷۰ [4] ایضاً۔

یہاں امیر بخارا کا سپہ سالار بکتوزون موجود تھا، اس کو محمود کے ارادہ کا پتہ چلا تو وہ نیشاپور سے باہر نکل گیا، اس کی اطلاع جب ابوالحارث منصور کو ملی تو وہ خراسان کی طرف بڑھا، محمود نے جب دیکھا کہ منصور کے اقدامات اس کی بے عقلی کی وجہ سے ہیں، تو اس نے ابوالحارث سے لڑنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ سامانی خاندان جس نے مدت تک خراسان اور ماوراء النہر پر حکومت کی ہے، اپنی سیاسی و علمی و تمدنی خدمات کے لحاظ سے شہرۂ آفاق ہے، اس کا خاتمہ اس کے ہاتھ سے ہو، کیونکہ بہرحال محمود اتنا تو جانتا تھا کہ ابوالحارث منصور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا فوجی برتری کے علاوہ آخر الذکر کے یہاں جو انتشار تھا اس سے محمود بخوبی واقف تھا، بکتوزون ایک طرف تو ابوالقاسم سے برسرپیکار تھا، دوسری طرف فائق سے دست و گریباں، پھر وہ محمود کا مقابلہ بھی کرنا چاہتا تھا، غرض محمود نیشاپور کی آویزش ترک کر کے مرو گیا اور پھر پل زاغول ابھی وہیں مقیم تھا کہ اس نے سنا کہ فائق اور بکتوزون نے مل کر سرخس میں ابوالحارث منصور کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی[1] اور اس کے بجائے عبدالملک بن نوح کو تخت نشین کرایا، یہ سانحہ چہارشنبہ ۱۲ صفر ۳۸۹ھ[2] میں رونما ہوا، اور اس سانحہ سے خواص اور عوام دونوں بہت متاثر ہوئے ابو منصور ثعالبی نیشاپوری کے مشہور قصیدے میں اس واقعہ کا مختصر لیکن درد انگیز ذکر ملتا ہے:

الم تر مذ عامین املاک عصرنا — یصیح بهم للموت والقتل صائح

فنوح بن منصور حوته ید الردیٰ — علی حسرات ضمنتها الجوائح

ویا بؤس منصور فی یوم سرخس — تمزق عنه ملکه وهو طائح

وفرق عنه الشمل بالسمل فاغتدی — اسیراً ضریراً تنتحیه الجوائح

[1] ترجمہ تاریخ بیہقی ص ۱۷۳ [2] تاریخ بیہقی میں یہ تاریخ ابوالحارث کو قید کرنے کی ہے، اس کے ایک ہفتہ بعد سلائی پھروائی گئی، تو تاریخ ۱۹ صفر ہوگی ص ۶۴۱۔

(کیا تو نہیں دیکھتا کہ دو سال سے زیاد کنندہ اور نوحہ گر بادشاہان روزگار کی وفات اور قتل پر نوحہ گری کر رہا ہے، موت کے ہاتھ نے نوح بن منصور پر تسلط پایا، اس حالت میں کہ حسرت و اندوہ سے اس کا سینہ پُر تھا، اسی طرح منصور کی پریشانی و مصیبت کہ سرخس کے مقام پر (بکتوزون اور فائق کے ہاتھوں) اس کی حکومت چھنی، اور وہ ہلاک کے قریب ہوا، اس کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی، اس کا حال ابتر ہوا، اور وہ اسیر و نابینا اور سختی اور مصیبتوں سے دوچار ہوا)

تاریخ بیہقی میں فائق کی مناسبت[1] سے یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: امیر ابوالحارث منصور بن نوح نیک رو اور بہادر نوجوان تھا، لیکن اس کے مزاج میں سختی تھی، نہایت معاملہ فہم تھا، بکتوزون نیشاپور میں سپہ سالار تھا، امیر محمود بھی اس کا خواہاں تھا، منصور دونوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا، لیکن اس کی توجہ بکتوزون کی طرف زیادہ تھی، محمود کو جب صورت حال کا اندازہ ہوا تو اس نے بکتوزون سے نمٹنے کا ارادہ کیا، بکتوزون نے امیر منصور سے شکایت کی، امیر ایک بڑے لشکر کے ساتھ بخارا سے مرو کے ارادے سے نکلا، فائق الخاصہ بھی ساتھ تھا، امیر منصور چاہتا تھا کہ معاملہ بغیر لڑائی کے طے ہو جائے، چند روز مرو میں تھے پھر سرخس کی طرف چلے، بکتوزون سمجھتا تھا کہ امیر کا رجحان محمود کی طرف ہے، اس لیے اس کی طرف سے بکتوزون کو اطمینان نہ تھا، اس لیے ایک روز خفیہ طور پر فائق سے کہا کہ "یہ بادشاہ جوان ہے اور اس کا میلان محمود کی طرف زیادہ ہے، اگر امیر قوی ہو جاتا ہے تو نہ میں باقی رہوں گا اور نہ تم" فائق نے کہا: ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے کہا، یہ امیر ناحق شناس ہے کہ حق خدمت نہیں پہچانتا، اور محمود کی طرف بڑا میلان رکھتا ہے، اور مجھے بھی اطمینان نہیں، ایسا نہ ہو وہ مجھے اور تمھیں محمود کے سپرد کر دے، جس طرح اس کے باپ (نوح بن منصور) نے

[1] تاریخ بیہقی ص ۶۴۰۔ ۶۴۲۔

ابو علی سیمجور کو محمود کے باپ (سبکتگین) کے سپرد کر دیا تھا، ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ تجھ کو جلیل کا لقب کیوں دیا گیا جب کہ تو جلیل نہیں،" بکتوزون نے کہا مناسب رائے تو یہ ہوگی کہ اس کو تخت سے ہٹا کر اس کے کسی بھائی کو تخت نشین کرایا جائے، امیر منصور سرخس میں ایک رئیس کے گھر میں فروکش تھا، ایک روز دو سو غلاموں کے ساتھ شکار کو گیا، بکتوزون اور فائق بھی سرخس کے کنارے خیمہ زن تھے، منصور کا اس طرف سے گذر ہوا، بکتوزون نے اسے اپنے خیمہ میں آنے کی دعوت دی، امیر خیمہ میں آگیا، فوراً بیڑی اس کے پیر میں ڈال دی،

یہ واقعہ ۱۲ صفر ۳۸۹ھ کا ہے، ایک ہفتہ بعد اس کی آنکھ میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا، پھر اسے بخارا بھیج دیا، ۱۹ ماہ[1] کے قریب اس نے حکومت کی، فائق اور بکتوزون مرو آئے، اور عبد الملک بن نوح کو تخت پر بٹھایا، واضحاً اس وقت حالات نہایت ابتر تھے، ابو القاسم سیمجور آیا اور اس پر بڑی نوازش ہوئی، جب اس سانحہ کی خبر امیر محمود کو ہوئی تو وہ بہت غمگین ہوا، اور غصہ میں آکر کہا کہ اگر میں نے بکتوزون کو دیکھا تو اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں نکال لوں گا، امیر محمود ہرات سے نکلا، ایک لشکر جرار کے ساتھ مرو الروذ آیا، بخاری لشکر کی سرکردگی فائق، بکتوزون اور سیمجوری کر رہے تھے، دونوں لشکر روبرو اور آویزش کے لیے تیار تھے کہ ارکان دولت، ائمہ، مشائخ، قضاۃ و فقہاء نے سمجھا بجھا کر دونوں فریق کو مصالحت پر راضی کر لیا، طے پایا کہ بکتوزون کو خراسان کا سپہ سالار تسلیم کیا جائے، اور نیشاپور مع متعلقہ علاقہ کے

[1] زین الاخبار کی رو سے رجب ۳۸۷ھ کو نوح کی وفات ہوئی، واضح ہے کہ ابو الحارث منصور کی تخت نشینی کی تاریخ اواخر رجب ۳۸۷ھ ہوگی، اس طرح شعبان ۳۸۷ھ سے محرم ۳۸۹ھ تک ۱۸ ماہ پورے ہوتے ہیں، ۱۹ صفر کو اسے اندھا کیا گیا اور تخت سے ہٹایا گیا، اس حساب سے ۱۸ ماہ ۱۹ دن ہوئے، رجب کے چھ دن جوڑنے کے بعد بھی پورا مہینہ نہیں ہوتا، بالفاظ دیگر ۱۹ ماہ سے کم جو اس کی مدت حکومت بیہقی میں درج ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

اس کے حوالہ ہوں، اور بلخ و ہرات کی ولایت محمود کے پاس رہے، محمود کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ بغیر خون خرابہ معاملات طے ہو گئے، جمادی الاولیٰ ۳۸۹ھ میں چار روز ابھی باقی تھے کہ محمود نے کوچ کا نقارہ بجوایا، اپنے بھائی امیر نصر کو چھوڑ کر خود واپس روانہ ہوا، ابھی اس کو روانہ ہوئے زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ دارا بن قابوس نے سامانی لشکریوں کو ورغلایا اور وہ محمود کے خیمہ گاہ پر لوٹ مار مچانے لگے، امیر نصر نے ان کا مقابلہ کیا اور محمود کو واپس بلانے کے لیے سوار بھیجے، وہ فوراً واپس آیا، اور دو دن میں اس نے سامانی گروہ کو تتر بتر کر دیا، اور ایسی لوٹ مار مچائی کہ وہ بے سروسامان منتشر ہو گئے، امیر خراسان شکستہ دل بخارا چلا گیا، فائق اسی سال شعبان میں راہیٔ ملک بقا ہوا، بکتوزون بھی بخارا بھاگ نکلا، اور ابو القاسم سیمجوری نے محمود کی پناہ حاصل کر لی، دوسری طرف ایلک ابو الحسن نصر علی نے اوزگند سے حملہ کر دیا، یکم ذی الحجہ ۳۸۹ھ کو بخارا میں داخل ہوا اور ایسا ظاہر کیا کہ گویا اطاعت اور مدد کے لیے آیا ہے، ایک روز بعد بکتوزون مع اس کے ساتھیوں کے گرفتار کر لیا گیا، اور امیر خراسان کو اس کے بھائیوں اور عزیزوں سمیت پکڑ کر اوزگند بھیج دیا، اور اس طرح دولت آل سامان کا خاتمہ ہوا[1]

فائق کے قابل ذکر واقعات میں ایک یہ ہے کہ وزیر ابو العباس فضل بن احمد اسفراینی اس کا پروردہ تھا جو اس کے دور میں اس کا مشہور کاتب تھا، نیشاپور میں محمود غزنوی کے دور امارت میں صاحب برید ہوا، اور آخر میں وزیر بھی ہوا، اسی طرح اس کا بیٹا ابو القاسم بھی علم و فضل میں یگانہ تھا، اس کا ایک اور بیٹا بھی ادیب و شاعر تھا، غرض اس مشہور خاندان کی سیاسی عظمت کے ضمن میں فائق الخاصہ کا نام ضرور آئے گا۔

[1] دیکھیے ترجمہ تاریخ یمینی ص ۳۳۷ - ۳۴۲ -

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعض امتیازی کارنامے

از

ضیاء الدین اصلاحی

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے ممتاز صاحب علم وکمال اور نامور محدث تھے، ہندوستان کی علمی تاریخ میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، خصوصاً حدیث نبویؐ سے ان کا شغف وانہماک بہت بڑھا ہوا تھا، اور اس میں ان کے کارنامے گوناگوں ہیں، اس فن میں ان کی چند نمایاں خصوصیات اور اہم امتیازات ہیں، جن کو ان کی اولیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مثلاً:

(۱) وہ مسلسل باون[۵۲] برس تک حدیث کے درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، انھوں نے کتب حدیث کو اپنے زمانہ کے نصاب درس میں شامل کرکے اس کا لازمی جزء بنا دیا، جس کا اس عہد میں کوئی رواج نہ تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:

"الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی، المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں یہاں کے علماء کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا[۱]"

[۱] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۷۵۔

(۲) انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود زندگی بھر حدیث کا درس دیا، بلکہ اس کی تعلیم وتعلم کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری کر دیا جس کو ان کے بعد ان کی اولاد واحفاد نے بھی قائم وباقی رکھا، ہندوستان میں ان کے خاندان کو سات آٹھ پشتوں تک فن حدیث کی خدمت کا شرف نصیب ہوا، شیخ محدث کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"کتب احادیث کو اپنے زمانہ کے نصاب ومنہاج کا ایک لازمی جزء بنا دیا، خود انھوں نے اپنے مدرسہ میں کتب حدیث کے باقاعدہ درس کی ابتدا کی، ان کے بیٹے اور پوتوں نے اپنے مدرسہ کی اس خصوصیت کو برقرار رکھا[۱]"

(۳) ہندوستان میں علم حدیث کے اکثر اصول وروایات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں، جن کو بعد کے لوگوں نے مزید ترقی واستحکام بخشا۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے والے، اس کی داغ بیل ڈالنے والے اور اسے پھیلانے والے[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ پہلے شخص ہیں، یہ بات چاہے کلیتہً صحیح نہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے درس وافادہ، اس کی نشر واشاعت، اس سے متعلق تحقیق وتدقیق اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ ان ہی کی ذات سے شروع ہوا، اس طرح درس وتصنیف کے ذریعہ ہندوستان میں علوم حدیث کو رائج ونشر کرنے میں ان کو اولیت ضرور حاصل ہے، مولوی رحمان علی فرماتے ہیں:

"علم حدیث بہ محروسۂ ہندوستان ... از وے شیوع یافتہ[۳]"

سرزمین ہند میں علم حدیث ان ہی کی ... بدولت شائع وذائع ہوا۔

[۱] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۴ [۲] بہت مشہور فقرہ ہے: اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود [۳] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۰۹۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا بیان ہے :

"مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی، اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں عام کیا۔"[1]

مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی رائے بریلوی سابق ناظم ندوۃ العلماء تحریر فرماتے ہیں :

"وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے باشندگان ہند میں حدیث کا فیض عام کیا، اور دہلی کے دارالسلطنت میں درس و افادہ کی مسند پر متمکن ہوئے، اور اپنی ساری توجہ اسی کام کے لیے مرکوز کر دی۔"[2]

یہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند میں علم حدیث کے احیاء کا سہرا ان ہی کے سر ہے، انھوں نے پہلی مرتبہ دہلی کے دارالسلطنت کو علم حدیث کا مرکز بنایا، اور گھر گھر میں حدیث کا عام چرچا کر دیا، اسی حیثیت سے غالباً انھیں ہندوستان کا اول المحدثین کہا جاتا ہے، پروفیسر نظامی ارقام فرماتے ہیں :

"ایک ایسے دور میں جب کہ علم حدیث شمالی ہندوستان میں تقریباً ختم ہو چکا تھا، انھوں نے اپنی مسلسل اور پرخلوص جد و جہد سے اس کو از سر نو زندہ کیا۔"[3]

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علمائے ہند میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حرمین کا سفر کیا، وہاں حدیثیں پڑھیں، اور وہاں سے حدیث کی کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لائے، اور انھیں داخلِ درس کیا۔ پورے ہندوستان کی نسبت سے اگر اس بات کو درست نہ مانا جائے تب بھی شمالی ہند اور دہلی کی حد تک اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ خیال پہلے نقل کیا جا چکا ہے :

"شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے، اور ان کو درس میں داخل کیا ... بہر حال شیخ عبدالحق کے ذریعہ مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہو گئے، اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا۔"[1]

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"بہر حال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں، اور اس بارۂ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ان کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فیوض حرمین کا ممنون ہونا چاہیے۔"[2]

پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں :

"علم حدیث کی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ حجاز اور وہاں کے محدثین سے براہ راست تعلق پیدا کیا جائے، شیخ عبدالحق نے علم حدیث حجاز میں حاصل کیا، ان کے بعد ہندوستان میں محدث بننے کے لیے حجاز میں قیام اور علمائے حجاز سے استفادہ ضروری سمجھا جانے لگا۔"[3]

فضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مدراسی کا بیان ہے :

"اکبری دور کے ملحدانہ خیالات کی رو میں جاہ پرست علماء کے قدم ڈگمگا گئے تھے، لیکن شاہ صاحبؒ کے خاندانی ماحول اور تربیت اور سفر حرمین شریفین کی وجہ سے ان میں وہ دو خوبیاں ابھر آئی تھیں جن کی بدولت ہندوستان میں علوم حدیث کے احیاء و ترویج و اشاعت کا

---

[1] تذکرہ، مرتبہ مالک رام ص ۳۰۱ [2] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۳۷ [3] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۸۳

[1] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۵ ، [2] ایضاً ص ۹ ، [3] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۸۵۔

سہرا ان کے سر رہا[1]۔"

(۶) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے عربی زبان کی اہم کتابوں کا فارسی ترجمہ کرکے ان کے فوائد کو عام کیا، اس سلسلہ میں احادیث کی کتابوں کے بھی فارسی زبان میں ترجمہ کرنے اور ان کے متون کی فارسی میں شرحیں لکھنے کی سعادت سب سے پہلے ان ہی کے حصہ میں آئی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت شاہ عبدالحق محدثؒ جس دورِ علم و تعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک عام خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف و ترجمہ کی بنیاد ڈالی، خود شاہ صاحبؒ نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا[2]۔"

مولانا سید سلیمان ندویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"ان کا دوران کے سلسلہ کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ان (حدیث کی) کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور فارسی میں ان کی شرحیں لکھیں[3]۔"

اس مضمون میں شیخ محدث کے تعلیمی، علمی اور اصلاحی کارناموں کا ذکر کرکے ان کی شرح مشکوٰۃ (فارسی) کا جائزہ لیا جائے گا۔

درس و تدریس اور شیخ کا مدرسہ

شیخ عبدالحق کے علمی فیضان کا سلسلہ ان کی روانگی حجاز سے پہلے ہی شروع ہوگیا تھا، مگر ان کے اصل کارناموں، علمی و دینی مشاغل اور عملی سرگرمیوں کی باقاعدہ ابتدا حجاز کے سفر سے واپسی کے بعد ہوتی ہے، اس زمانہ میں انھوں نے گوناگوں دینی، علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں، اس سلسلہ میں ان کا ایک بہت نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ حجاز سے آنے کے بعد

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، پیش لفظ ص ط۔ [2] تذکرہ ص ۳۰۳-۳۰۴۔ [3] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۵۷۔

وہ مدۃ العمر درس و تدریس کے مسند پر فروکش رہے، دینی علوم کی نشر و اشاعت اور کتب دینیہ خصوصاً احادیث کی تعلیم کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی، اور درس و تدریس کے مشغلہ میں ایسا منہمک ہوئے کہ اس کے لیے سچ مچ اپنا خواب و خور حرام کردیا، اور اپنے شیوخ و مرشدین شیخ عبدالوہاب متقی اور شاہ ابوالمعالیؒ کی ہدایت کے مطابق سیر و سفر، لوگوں سے ملنا جلنا اور دہلی سے باہر جانا سب کچھ چھوڑ دیا۔

درس و تدریس کے لیے انھوں نے جو مدرسہ قائم کیا تھا اس میں ایک نیا نظام تعلیم جاری کیا جو عام درسگاہوں کے نصاب تعلیم سے مختلف تھا، ان کے حلقۂ درس و تدریس اور تعلیمی اصلاح و انقلاب کی خصوصیت و اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس عہد کے علمی و تعلیمی حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

ہندوستان میں دینی علوم بالخصوص قرآن مجید و حدیث نبویؐ کی تعلیم و تعلم کی جانب بہت کم توجہ رہی، کیونکہ سندھ اور ملتان وغیرہ سے عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب غزنوی، غوری، خلجی اور تغلق سلاطین برسر اقتدار آئے تو ان کے زمانہ میں ایران، خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقوں سے جو اصحاب علم و درس ہندوستان آئے، ان کو دینی علوم تفسیر و حدیث میں زیادہ درخور نہ تھا، اس کی وجہ سے ہندوستان میں علم حدیث عنقا ہوگیا، اور نجوم، فلکیات، ریاضی اور منطق و فلسفہ کی گرم بازاری رہی، قرآن مجید اور احادیث کو پڑھنے پڑھانے کے بجائے دینی علوم میں صرف فقہ و تصوف سے سروکار رہ گیا تھا، فقہ میں بھی سارا زور فقہ حنفی کے فروع و جزئیات پر صرف کیا جاتا تھا، علم حدیث کی کس مپرسی اور بیچارگی کا یہ حال تھا کہ اس سے صرف اس وجہ سے اور اس حد تک سروکار رہ گیا تھا کہ فقہی بحثوں میں کہیں کہیں حدیثوں کا ذکر بھی آجاتا تھا، حدیث کی امہات کتب کے بجائے صرف صغانی کی مشارق الانوار درس و تدریس میں داخل تھی، اگر کسی نے

اس سے سوا توجہ دی تو مصابیح السنۃ بغوی اور مشکوٰۃ المصابیح کو بھی دیکھ لیا، محدث بننے کے لیے بس اسی قدر کافی تھا، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مولانا حکیم سید عبدالحیٔ دونوں نے ہندوستان کے اسلامی مدارس اور علماء کے درس کی اس زبوں حالت اور دردناک کیفیت کا ذکر کیا ہے، چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں:

"علم حدیث کا سرے سے کوئی چرچا نہ تھا، لوگ نہ خود اس کی جانب مائل تھے اور نہ دوسروں کو اس کے حصول کی کوئی ترغیب دیتے تھے، وہ اس فن سے ناآشنا، اس کی کتابوں سے ناواقف اور محدثین کے ناموں سے بے خبر تھے، بہت تھوڑے لوگ صرف مشکوٰۃ پڑھ لیتے تھے، اور وہ بھی محض حصول برکت کے لیے، اس پر عمل کرنا اور اس کو سمجھنا ان کا مقصد نہ ہوتا، فقہ میں صرف فقہ حنفی اور علمائے ماوراء النہر کے فتووں اور اجتہادات پر قانع ہو گئے تھے، اور محض فروع و جزئیات میں الجھے رہتے تھے، ان کا راس المال فقہ تھی، وہ بھی تقلیدی رنگ و انداز میں، تحقیق سے معدودے چند لوگوں ہی کو دلچسپی تھی[1]"

مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے، اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان، خلعت اور علم بھی ملا تھا، اور خلیفۂ عباسی سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے عباسی خلیفہ کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۷، والثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۳۵ تا ۱۳۸۔

پوچھنا ہے؟

الغرض شیخ عبدالحق محدثؒ سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری (المتوفی ۶۵۰ھ) کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی (المتوفی ۵۱۶ھ) کے نسخے دستیاب ہوتے تھے، اور یہی دو کتابیں یہاں کے علماء کے درس میں تھیں[1]"

علماء اور اصحاب درس نہ نصوص کی پروا کرتے تھے اور نہ بحث و استدلال میں احادیث کو حجت و بنیاد بناتے تھے، اجتہاد و تحقیق کا تو دروازہ ہی سرے سے بند تھا، فقہی اقوال کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تولنے اور پرکھنے کے بجائے خود قرآن و حدیث کی کسوٹی فقہ کو بنا لیا گیا تھا، نصوص کی بے دھڑک توجیہ و تاویل کی جاتی تھی، یا سرے سے ان کو ترک ہی کر دیا جاتا تھا، معقولات کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان اور فلسفہ و کلام سے کثرت اشتغال کی وجہ سے دین کی حقیقت و صورت مسخ ہونے لگی تھی، شریعت محمدی کی روح غائب ہوتی جا رہی تھی، اور بدعتوں اور گمراہیوں کا زور بڑھتا جاتا تھا۔

حدیث نبویؐ سے بے اعتنائی و بے رغبتی اور منطق و فلسفہ سے غیر معمولی شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایران سے آنے والے علماء نے علوم عقلیہ کو خاص طور پر ہندوستان میں بڑا رواج اور فروغ دیا، شیخ فتح اللہ شیرازی نے متاخرین علمائے ایران محقق دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان وغیرہ کی تصانیف کو ہندوستانی مدارس کے نصاب میں داخل کر کے ان کی نشر و ترویج کی، چنانچہ طلبہ و متعلمین ان ہی کا درس لیتے اور ان ہی میں الجھے رہنے کی بنا پر قرآن و حدیث کے علوم سے ناآشنا اور بے خبر رہتے، ان کی ساری زندگی حکماء و فلاسفہ کے نظریات کے مطالعہ و تحقیق میں بسر ہوتی، صوبہ گجرات کے مشہور زمانہ عالم و فاضل

[1] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۵،

ابوالفضل گازرونی اکثر و بیشتر طوسی کی کتاب "التجرید"، شیخ بوعلی سینا کی "شفا" و "اشارات" اور "بطلیموس" کی مجسطی کا درس دیا کرتے تھے، طلبہ ان کے پاس سفر کرکے آتے تھے، پنجاب میں علامہ کمال الدین کشمیری اور ان کے شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے درس کا غلغلہ مچا ہوا تھا، یہ دونوں بزرگ مختلف علوم کا درس دیتے تھے، مگر نہ مدارس کی اصلاح کر سکے، اور نہ ان کے نصاب میں حدیث کو داخل کر سکے[1]۔

اس زمانہ کے امراء و سلاطین کو رموز مملکت کی گتھیاں سلجھانے اور شورشوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی، وہ تعلیم و تعلم کا نظم و اہتمام کیا کرتے، دہلی سے دور بعض علماء کے علوم دینی کے مرکز قائم تھے، لیکن جیسا کہ اوپر گذرا، ان میں سے اکثر و بیشتر میں کتاب و سنت کے بجائے معقولات اور متاخرین علمائے ایران کی تصنیفات زیر درس تھیں۔

یہی حالات تھے جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی مسند درس پر رونق افروز ہوئے، اور ایک دینی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، وہ خود علم دین سے پوری طرح بہرہ ور تھے، اور ہند و حجاز کے علمائے کاملین سے مکمل استفادہ کر چکے تھے، ان کے نزدیک بگڑے ہوئے مذاق و ماحول کی اصلاح اور فتنوں اور گمراہیوں کا انسداد علم دین کے فروغ و اشاعت ہی سے ہو سکتا تھا، اس لیے انھوں نے تیرہ و تاریک ماحول میں علم دین کی قندیل روشن کی اور علماء کو فضول مذہبی مناقشوں، تکفیر و تفسیق کی ہنگامہ آرائیوں اور معقولات کی پُرپیچ بحثوں کو چھوڑ کر کتاب و سنت کی تعلیم کی جانب راغب ہونے کی دعوت دی، اور فقہ و فروع کے غیر ضروری مسائل میں الجھنے کے بجائے مہمات دین کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین کی۔

ان کے فیض سے دینی علوم خصوصاً حدیث کو بڑا فروغ نصیب ہوا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

[1] المحدثان للدکتور محمد احمد صدیقی ص ۱۱۵۔

حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں ان ہی کی کوششوں سے کتاب و سنت کا نور پھیلا، اور شرک و بدعت کا قلع قمع ہوا، اس طرح دہلی سلطنت و حکومت کا مرکز و پایہ تخت ہونے کے ساتھ ہی علم دین کا بھی دار السلطنت اور مرکز بن گئی۔

شیخ محدث کا مدرسہ دہلی ہی کا نہیں، بلکہ شمالی ہند کا پہلا مدرسہ تھا جس میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اہم کتابوں کا درس ہوتا تھا، انھوں نے دینی تعلیم کا ایسا مستحکم نظام قائم کیا تھا جس سے ہندوستان میں ایک علمی انقلاب رونما ہوگیا، اور جس سے مسلمانوں کے معاشرہ کو ایک نئی توانائی اور نئی زندگی مل گئی تھی، بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

"مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحقؒ حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی، اور ان کی تدریس و تصنیف نے ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں قائم کر دیا[1]۔"

شیخ عبدالحقؒ کے مدرسہ اور نصاب درس میں دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو مرکزیت و اولیت حاصل تھی، انھوں نے مسند درس اسی لیے بچھائی تھی کہ علم دین کا صحیح اور خالص ذوق پیدا کرکے دوسرے علوم سے لوگوں کو بیزار کر دیں، کتاب و سنت کی تعلیم کو فروغ دے کر معقولات و مظنونات سے رخ پھیر دیں، عقلی علوم کی کتابوں کو درسیات سے خارج کرکے احادیث کی کتابوں کو نصاب درس میں شامل کر دیں، ان کی درسگاہ کا نصاب اس زمانہ کی دوسری درسگاہوں سے مختلف تھا، اور بقول پروفیسر نظامی اس کے نظام درس میں قرآن و حدیث کو تمام علوم کا مرکزی نقطہ قرار دیا گیا تھا، اور اس کا اصل مقصد اس سرزمین اور اس ملک میں حدیث نبویؐ کی ترویج و اشاعت تھا، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

[1] تذکرہ: ص ۳۰۱۔

"حج سے واپسی کے بعد باون (۵۲) برس تک استقلال و دلجمعی کے ساتھ درس و تدریس کے مشغلہ میں منہمک رہے، اپنے فرزندوں اور دوسرے طلبہ کو پڑھاتے رہے، علوم و فنون بالخصوص حدیث کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے، انھوں نے تعلیم و تدریس کا نیا انداز اور ایسا نہج اختیار کیا جس کو ممالک عجم کے متقدمین و متاخرین علماء نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، انکا طریقۂ درس امتیازی خصوصیات کا حامل تھا، اور ان کا مدرسہ عام مدرسوں سے ممتاز و مستثنیٰ تھا"[1]

شیخ عبدالحق کے مدرسہ سے سینکڑوں طلبہ اور متعدد اساتذہ وابستہ رہے ہوں گے جن کا ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رہا ہوگا، لیکن افسوس اس کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔

فن حدیث پر عبور

شیخ عبدالحق علم حدیث میں یکتا اور بہت ممتاز تھے، اس فن میں نمایاں خدمات اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے "محدث" ان کے نام کا جز ہو گیا ہے، دارا شکوہ نے انھیں "امام محدثان وقت"[2] کہا ہے، خافی خان کا بیان ہے کہ "وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے، پورے ہندوستان میں تفسیر و حدیث میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا"[3]، انھوں نے اس فن سے عمر بھر اشتغال رکھا، اور اس کی عظیم الشان اور گوناگوں خدمات انجام دیں، اور اس میں تصنیفات، تراجم اور شروح کا لازوال ذخیرہ یادگار چھوڑا، ان کی غیر معمولی شہرت کی حامل کتب حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں ید طولیٰ اور مافوق العادت مہارت رکھتے تھے، مولانا غلام معین الدین عبداللہ کا بیان ہے کہ "انھوں نے علم حدیث میں شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ علی متقی کا کامل تتبع کیا، اور اس علم کی تحقیقات کو انتہائی حد کمال تک پہونچا دیا"[4]

فن حدیث میں شیخ کے خدمات و کمالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، ان کا سب سے

[1] آثار الکرام ج ۱، ص ۲۰۱ [2] بحوالہ سکینۃ الاولیاء ص ۱۱۵ [3] منتخب اللباب ج ۱ ص ۲۴۰ [4] معارج الولایۃ، قلمی بحوالہ مقدمہ نوریہ سلطانیہ ڈاکٹر سلیم اختر ص ۵۱۴۔

بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں علم حدیث کو غیر معمولی فروغ دیا اور حجاز سے واپسی کے بعد وہ عمر بھر اسی کی آبیاری کرتے رہے، شیخ نے اس علم کی جانب خصوصیت سے اس لیے زیادہ اعتنا کیا کہ ان کے زمانہ میں کتاب و سنت کے بجائے دوسرے علوم و فنون لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

دین کے اصل سرچشمہ سے غفلت اور دوری کی بنا پر حق و صداقت کی روشنی ماند پڑ گئی تھی، اور بے دینی، ضلالت اور بدعت کی تیرگی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، اس لیے انھوں نے دین کی اصل حقیقت کو روشن اور نمایاں کرنے کے لیے احادیث کی جانب شدت سے اعتنا کیا، اور اسکی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، حدیث کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند کر کے لوگوں کو اس کی اہمیت و ضرورت کا احساس دلایا، اس کے رجال و اسناد اور اصول و متون کی تدوین و تحقیق، اس کے حقائق و معارف کی جستجو و دریافت، اس کے اسرار و غوامض کی عقدہ کشائی، اور اس کی کتابوں کے شروح و حواشی لکھ کر اس کے خزانے کو سب کے لیے عام کر دیا، ان کی اس سعی بلیغ کے نتیجہ میں حدیث نبویؐ کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ گیا، اور اس کا ہر طرف عام چرچا اور بول بالا ہو گیا، ہندوستان میں علم حدیث کے احیاء و ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کی جو سعادت و فضیلت ان کے حصہ میں آئی، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی، غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ "شیخ نے علوم و فنون کی اشاعت کی، بالخصوص حدیث کی نشر و اشاعت اور اس کی ترویج و ترقی میں جو کارنامہ انجام دیا وہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے بھی ہندوستان میں انجام نہیں دیا"[1]

شیخ کا یہ بھی زریں کارنامہ ہے کہ انھوں نے حدیث کے درس و تدریس اور اس کی ترقی و توسیع کا ایک ایسا طویل سلسلہ اور وسیع نظام قائم کر دیا جو ان کے بعد بھی مدت دراز تک جاری رہا،

[1] سبحۃ المرجان ص ۵۲۔

ہندوستان میں ان کی اور ان کے علمی خانوادہ کی یہ بڑی اہم خصوصیت ہے کہ اس کی بدولت صدیوں علم حدیث کا چشمہ ابلتا رہا، دراصل انھوں نے علم حدیث کے سلسلہ میں متعدد ایسے اہم اور بنیادی کام انجام دیے ہیں جن کی بنیاد پر آگے چل کر نہایت عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہوئیں، ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ اور احادیث کے فروغ و اشاعت میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بہت نمایاں ہے، لیکن ان کے کاموں کی داغ بیل شیخ عبدالحق محدثؒ ہی نے ڈالی تھی، شاہ صاحبؒ نے ان ہی کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھایا، اور پایۂ تکمیل تک پہونچایا، پس جہاں تک ہندوستان میں حدیث کے رواج و قبول کا معاملہ ہے اس کا اصلی سہرا شیخ عبدالحق محدثؒ ہی کے سر بندھتا ہے، اسی لیے ایک زمانہ تک یہ مشہور رہا کہ ہندوستان میں علم حدیث کی داغ بیل ڈالنے والے اور یہاں اس کی تخم ریزی کرنے والے پہلے شخص وہی ہیں، نواب صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہی سے علم حدیث معدوم تھا، یہاں تک کہ اللہ نے اس سرزمین پر اپنا فضل و احسان کیا، اور یہاں کے بعض علماء جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ کو اس علم سے نوازا، یہ شیخ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے اور اس کے باشندوں پر اس کا فیض عام کرنے والے پہلے شخص ہیں"[1]

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ مرحوم لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالحقؒ ہندوستان کے باشندوں پر علم حدیث کا فیض جاری کرنے والے پہلے آدمی ہیں، انھوں نے دارالحکومت دہلی میں اس کے درس و افادہ کا سلسلہ قائم کیا اور اپنی ساری محنت و توجہ اسی کام پر مرکوز کردی، اس فن میں کتابیں تصنیف کیں، حدیثوں کی تخریج کی اور نہایت جانفشانی سے

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۷۰۔

اس کی نشر و اشاعت کی[1]"۔

یہ بات چاہے اس تفصیل کے ساتھ صحیح نہ ہو مگر ہندوستان کی سرزمین پر علم حدیث کے درس کا ایک منظم نظام اور تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنے کا شرف شیخ عبدالحقؒ ہی کو حاصل ہے، ان سے پہلے گجرات اور بعض ساحلی علاقوں میں حدیث کی تعلیم و تعلم کا انفرادی طور پر رواج تھا، کچھ مدارس بھی تھے مگر نہ تو ان کا کوئی باقاعدہ نظم و اہتمام تھا، اور نہ حدیث کو پڑھنے پڑھانے کا کوئی خاص دستور و قاعدہ تھا، خصوصاً شمالی ہند میں حدیث کا علم کبریت احمر کی طرح نایاب ہوگیا تھا، مگر شیخ نے گجرات کے بجائے دہلی کو علم حدیث کا مرکز بنادیا، اور ان کی بدولت درس و تدریس کا منظم سلسلہ شمالی ہند میں بھی جاری ہوگیا، مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ رقمطراز ہیں:

"اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھادیا، اور جس نے دہلی کے شاہی دارالسلطنت کو ہمیشہ کے لیے علوم دین کا دارالسلطنت بنادیا، اور جس کی نسبت اہل علم کا اعتراف ہے کہ "اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود"! گو نئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں، تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقف عام کیا، اور دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفرین کی داد وصول کی"[2]

مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم فرماتے ہیں:

"مجدد صاحبؒ کے کارناموں کے ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم حدیث کو زندگی ملی، اور سنت نبوی کا

[1] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۳۷ [2] مقالات سلیمان ج ۲، ص ۲۳۔

خزانہ ہر خاص و عام کے لیے عام ہوگیا، ہمارے نزدیک حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علماء اور صوفی بس متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہ گئے، اور کم از کم شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہوسکا، بد دینی اور بدعقیدگی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے، شیخ عبدالحقؒ نے اس جہل کو دور کرنے کی کوشش کی، اور اس لیے ہم آج ان کے شکر گذار ہیں، اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں[1]۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) بلکہ امام ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) سے پہلے سنت کی گرم بازاری نہیں ہوئی[2]۔"

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کتاب التمہید فی ایمۃ التجوید کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں اشاعت حدیث بارہویں صدی ہجری میں اس وقت ہوئی جب گیارہویں صدی کی ابتدا میں شیخ عبدالحق دہلوی (حرمین سے) تشریف لائے، اور دہلی میں قیام پذیر ہو کر تقریباً پچاس برس تک حدیث کا درس دیا[3]۔"

شیخ محدثؒ کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اگرچہ اس کی شد و مد سے تردید کی ہے کہ "شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے پہلے ہندوستان کے مسلمان علم حدیث سے ناآشنا تھے اور مشارق الانوار کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب سے واقفیت نہیں رکھتے تھے" تاہم وہ بھی شمالی ہند میں شیخ محدث دہلویؒ کی فیض رسانی، اولیت اور ان کے درس اثرات کا اس طور پر اعتراف کرتے ہیں:

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] ایضاً ص ۲۶۸۔

"بہر حال حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہوچکا تھا، انھوں نے اس تنگ و تاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھینچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہوگیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز نقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آگیا، گیارہویں صدی ہجری کے شروع سے تیرہویں صدی کے آخر تک علم حدیث پر جتنی کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ دہلی یا شمالی ہندوستان میں لکھا گیا ہے، یہ سب مد شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا اثر تھا[1]۔"

شیخ عبدالحقؒ سے پہلے ہندوستان کی سرزمین میں، جو ائمۂ فن اور محدثین پیدا ہوئے انھوں نے دوسرے عرب اور اسلامی ملکوں میں بود و باش اختیار کرلی، اور وہیں اپنے علم و کمال کے جوہر بھی چمکائے، اسی لیے وہ ہندوستان کے بجائے ان ملکوں کی نسبت سے زیادہ مشہور ہوئے مگر شیخ عبدالحقؒ غالباً پہلے ممتاز ہندوستانی محدث ہیں جنھوں نے حرمین کا سفر کرکے وہاں کے علماء سے استفادہ تو بہت کیا، مگر وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے[2]، اور اسی کو اپنی تدریسی و تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز و محور بھی بنایا، لیکن اس کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ان کا غلغلہ بلند ہوا، اور ہر جگہ کے علماء ان سے فیضیاب ہوئے، ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا، اور معانیٔ حدیث کے فہم میں ان کے ممنون ہوئے، ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے پہلے محدث ہیں جو اپنی گوناگوں علمی و دینی خدمات، حدیث میں امتیازات اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے بلاد اسلامیہ میں مشہور و معروف ہوئے۔

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۴۳ [2] شیخ کے بعض اساتذہ خصوصاً شیخ علی متقی وغیرہ نے بھی ہندوستان میں قیام کرنے کے لیے ان کو خاص طور پر ہدایت کی تھی۔

اصلاحی خدمات

شیخ عبدالحقؒ جامع کمالات تھے، ان کی علمی بلندپائیگی تصنیفات کی کثرت اور تعلیمی وتدریسی خدمات کی وجہ سے ان کے بعض دوسرے کارنامے مخفی ومستور رہے، یا ان کو زیادہ نمایاں طور پر پیش نہیں کیا گیا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے ان کے ایک اور ممتاز کارنامہ رشد واصلاح کا سطور ذیل میں ذکر کر دیا جائے۔

شیخ عبدالحقؒ اپنے دور کے مصلح ومرشد بھی تھے، سترہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی اور معاشرتی اصلاح وتربیت کا سہرا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرح ان کے سر بھی بندھتا ہے، البتہ دونوں کا انداز مختلف اور طریقۂ کار جدا تھا، شیخ عبدالحقؒ نے زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ بہت مجاہدانہ اور سرفروشانہ انداز میں اصلاح وتجدید کا کام کیا، مگر وقت کے فتنوں اور گمراہیوں کا سدباب، باطل افکار ونظریات کی سرکوبی اور مسلمانوں کی معاشرتی ودینی اصلاح ان کے بھی پیش نظر رہی، اور انھوں نے اس کے لیے بھی اپنی زندگی وقف کی، وہ علمی آدمی تھے، اور ان کی طبیعت اعتدال وسکون پسند تھی، اس لیے تصادم اور ٹکراؤ سے بچ کر انھوں نے اصلاح وتربیت کا کام انجام دیا، منکر پر نکیر سے زیادہ معروف کی تلقین واشاعت پر زور دیا۔

اکبر کی غلط روش اور نادرست مذہبی پالیسی کی وجہ سے اس وقت جو خرابیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے بارے میں اس وقت دو طرح کے رجحانات پائے جاتے تھے، ایک گروہ تو اکبر کے مبتدعانہ اعمال اور گمراہ کن طریقوں کو نہ صرف جائز اور روا بتاتا تھا بلکہ ان کی پرزور حمایت اور تائید بھی کرتا تھا، مگر دوسرا گروہ ان باتوں کو شریعت اسلامی کے بالکل منافی سمجھتا تھا، اور نہایت جوش وشدت سے ان کی مخالفت ومقابلہ کے لیے کمربستہ رہتا تھا، شیخ عبدالحقؒ کی روش ان دونوں گروہوں سے الگ تھی، انھوں نے اپنی سرگرمیاں علم دین کی اشاعت وفروغ تک محدود رکھیں اور ارباب حکومت سے

کشمکش ومزاحمت کو پسند نہیں کیا، ان کی اس خاموش مگر ٹھوس تحریک کے اثرات نہایت دوررس اور گہرے نکلے۔

دراصل شیخ عبدالحقؒ کی علمی سرگرمیوں، حدیثی خدمات، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا تمامتر مقصد اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے دین وشریعت، ترویج کتاب وسنت اور اپنے زمانہ کی گمراہیوں اور خرابیوں کی اصلاح تھا، انھوں نے کتاب وسنت کے علم وتعلیم کا نظام قائم کرکے ان کی صحیح روح لوگوں میں پھونک دی، اور دین کی اصل حقیقت واضح کرکے لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح وتصحیح کر دی اور باطل افکار وخیالات اور بدعات ومنکرات کے فروغ کو روک دیا، اس لیے مسلمانوں کی مذہبی ودینی اصلاح کے سلسلہ میں نہ تو ان کے کارنامے کم اور غیراہم ہیں اور نہ نظرانداز کیے جانے کے لائق ہیں، مشہور مورخ ڈاکٹر سید معین الحق کی یہ تحریر قابل غور ہے:

> "شیخ عبدالحقؒ ان بزرگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اکبری عہد کے الحاد کو روکنے کی موثر کوشش کی، اس سلسلہ میں ان کی تصانیف ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ان کے مکاتیب بھی قابل ذکر ہیں، جوانی میں آپ کو اس گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی سرکردگی ابوالفضل کرتا تھا، لیکن باوجودے کہ آپ کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے، آپ نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا اور ساری زندگی درس وتدریس اور اصلاح معاشرہ کے لیے وقف کر دی، مسلمانان برصغیر کی دینی اور معاشرتی تاریخ میں شیخ عبدالحقؒ کی شخصیت بہت نمایاں مقام پر نظر آتی ہے"[1]

ذیل میں شیخ کے اصلاحی کارناموں کے بعض پہلوؤں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

دین کی غلط تعبیر وتاویل اور تحریف کی مخالفت

شیخؒ کے زمانہ میں کتاب وسنت کی تعلیم کو نظرانداز کر دینے اور فلسفہ، کلام اور فقہی جزئیات میں توغل کی وجہ سے فلسفہ کا ذوق اور عقلیت پسندی کا

[1] حاشیہ آثار الصنادید سرسید احمد خان مرحوم ص ۹۴-۹۵۔

رجحان اتنا بڑھ گیا تھا کہ نصوص دین کی غلط تعبیر اور انکی بیجا تاویل و توجیہ ہی نہیں بلکہ تحریف و تلبیس بھی کی جانے لگی تھی، اس طرح گوناگوں باطل افکار و خیالات پرورش پانے لگے تھے، اور متعدد خرابیاں اور گمراہیاں رونما ہورہی تھیں، شیخ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کے درس و تعلیم کی جانب لوگوں کا رجحان پیدا کر کے انھیں دین کی اصل حقیقت اور صحیح روح سے واقف کر دیا، ان کے نزدیک باطل خیالات اور گمراہ کن نظریات کا علاج و مداوا یہی تھا اس لیے انھوں نے اس کی جانب اپنی پوری توجہ مبذول کی، اور فلسفہ و کلام میں غور و خوض کو مذموم قرار دیکر عقلیت پسندی اور تاویل و تحریف کے دروازے کو مسدود کرنے کی فکر و سعی کی، ان کی متعدد تصنیفات دراصل ان کے دور کے رجحانات کے ردعمل کا نتیجہ ہیں، ان میں اس قسم کے شکوک و شبہات اور باطل افکار و نظریات کی بڑی خوبی سے تردید کی گئی ہے۔

عقیدۂ نبوت کے منافی امور، اور وحدت ادیان کا رد و ابطال

اکبری عہد کے فتنوں اور الحادی فلسفہ سے عقیدۂ نبوت و رسالت کی بیخ کنی ہو رہی تھی، شیخ عبدالحقؒ نے مدارج النبوۃ لکھ کر اس نظریہ کی تردید کی اور عقیدۂ نبوت و رسالت کا اثبات کیا۔

وحدت ادیان کا فتنہ بھی اسی سلسلہ کا ایک شاخسانہ تھا، چنانچہ کہا جاتا تھا کہ خدا پر ایمان ہی اصل ہے، اس کے تقاضے مجرد عقیدۂ توحید کو مان لینے سے پورے ہوجاتے ہیں، رسول اکرمؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، شیخ نے مدارج النبوۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق، مراتب و مناصب پر مفصل بحث کر کے بتایا کہ اسلام و ایمان کی تکمیل کے لیے توحید ہی کی طرح نبوت محمدی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، گویا انھوں نے ثابت کر دیا کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

نظریۂ الفی بھی اسی دور کی پیداوار ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف ہزار برس کیلیے تھا،

اب یہ مدت پوری ہوگئی، اس لیے احکام دین اور شریعت محمدیؐ متروک ہوگئی، اور ان کے اتباع کی ضرورت باقی نہیں رہی، شیخ نے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس غلط تصور اور گمراہ کن نظریہ کی بھی پر زور تردید کی اور ثابت کیا کہ احکام دین اور شریعت محمدی دائمی ہیں جن کی اتباع ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لیے ضروری ہے، ایک ہزار سال بعد بھی ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا۔

مہدوی تحریک کی تردید

مہدوی تحریک سے بھی نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑ رہی تھی، شیخ عبدالحقؒ کے زمانہ میں یہ تحریک بھی عروج پر تھی، اس کے بانی سید محمد جون پوری اور ان کے پیروؤں کی اولین جماعت بڑے پاک نفس اور خدا پرست لوگوں کی تھی، مولانا ابوالکلام آزادؒ تحریر فرماتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی، یعنی دعوت و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصد اصلی تھا، اور خود سید محمد اور ان کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں یہ ایک اصلاحی و دعوتی تحریک تھی جس کا مقصد احیائے شریعت اور امر بالمعروف کا قیام تھا، جو اس دور کے علمائے سو اور جاہ پسند لوگوں کی دنیا طلبی اور جاہل صوفیہ کی بدعات و منکرات کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔

سید محمد نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو علمائے سو اور دنیا پرست مشائخ کی طرف سے اس کی مخالفت کا ایک طوفان امنڈ پڑا، سلیم شاہ کے دور میں اگر ایک طرف شیخ علائی اور شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ مہدوی تحریک کے خاص داعی و مبلغ تھے تو دوسری جانب مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری، شیخ الاسلام وغیرہ نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا، مخالفین نے

---

[1] تذکرہ: مرتبہ مالک رام ص ۴۷۔

اپنی ریشہ دوانیوں سے بادشاہ کو بھی ورغلایا، اس کی وجہ سے اس تحریک کے حامیوں کو بڑے دشوار اور سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، مگر آگے چل کر مہدوی تحریک کی اصلی خصوصیات باقی نہیں رہیں اور اس کے پیروؤں میں بڑا غلو و تشدد پیدا ہوگیا، اور اس کے عقائد و نظریات میں بھی خرابی اور گمراہی پیدا ہوگئی، مولانا ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں:

"یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے، جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے، اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں بہت سی نئی نئی باتیں اور حد غلو سے بھی گذرے ہوئے اعتقادات شامل ہوگئے، اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتداء میں کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں، اور رفتہ رفتہ غلو و تاویل پچھلی امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لیے بھی ایک بڑا فتنہ رہا ہے، یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی، اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اختلاف کے غلو و محدثات میں گم ہوگئی"[1]

یہاں تک کہ اس جماعت کے عقائد تصور نبوت کے بھی منافی ہوگئے، اس بنا پر علمائے حق اور محدثین کو اس سے اختلاف ہوا، اور شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی وغیرہ اس کی مخالفت میں بہت پیش پیش رہے، شیخ عبدالحق ؒ نے بھی اپنے ان بزرگوں کی روش کے مطابق مہدوی تحریک کی مخالفت کی، مگر وہ علمی شخص اور اعتدال پسند آدمی تھے، اس لیے وہ اپنے دور کے فتنوں کے استیصال کے لیے علمی انداز اختیار کرتے تھے، اور ان کی مخالفت اعتدال پر مبنی ہوتی تھی، انھوں نے عقیدۂ نبوت کے باب میں مہدوی تحریک کی بے اعتدالی کا ذکر کرکے اس کی تردید کی ہے۔

علماء و مشائخ کی فتنہ سامانیوں کا استیصال

اکبری عہد کے اکثر فتنوں کا باعث نام نہاد علماء و مشائخ

[1] تذکرہ ص ۴۴۔

تھے، جو دنیا کی طمع اور مال و زر کی حرص میں دیوانہ ہوگئے تھے، یہ خود فسق و فجور میں ملوث رہتے مگر دوسروں کی تفسیق، تضلیل اور تکفیر کا ہنگامہ برپا کیے رہتے تھے، ان کے گھروں میں مال و دولت کا انبار جمع رہتا تھا، مگر اپنے فتووں اور حیلوں کا سہارا لے کر کبھی زکوٰۃ نکالنے کی نوبت نہ آنے دیتے، فریضۂ حج کو ساقط بتاتے اور اکبر کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے، گمراہ صوفیوں نے اپنے خود ساختہ اعمال و اشغال اور مجاہدات کو تصوف کا نام دے رکھا تھا، طریقت کو شریعت سے علیحدہ کرکے بعض عبادات و احکام سے اپنے کو دست کش کر لیا تھا۔

اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ اکبر کا متوازی دین الٰہی تھا، مگر اس کے انحراف کا سبب بھی یہی علماء و صوفیہ تھے، وہ ابتداء میں مذہب سے برگشتہ نہ تھا۔

ان علماء نے اہل و غیر اہل ہر طرح کے لوگوں کو اجتہاد کا حق دے دیا تھا، اس طرح ہر شخص مذہبی مسائل میں دخل دینے اور رائے زنی کرنے لگا، درباری علماء نے اکبر کو بھی اجتہاد کا منصب دیا، اور اس کی حیثیت شارع و مطاع جیسی بتائی، اس طرح اس کے دربار میں کھل کر اسلام اور شریعت محمدی کو بحث و تنقید کا نشانہ بنایا جاتا، اور جو چیز خلاف عقل معلوم ہوتی اس کو بے تکلف رد کر دیا جاتا تھا، غرض بادشاہ کی خوشنودی کے لیے ہر قسم کی من مانی تاویل اور دین میں کتربیونت کی جاتی، فیضی سے تعلق کی بنا پر شیخ عبدالحق ؒ ابتداء میں اکبر کے دربار میں حاضر ہوگئے، مگر وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس ماحول سے ایسا گھبرائے کہ ہندوستان ہی کو خیر باد کہہ دیا اور حرمین جا پہونچے، اور وہیں جا کر انھیں سکون و اطمینان نصیب ہوا اور پھر جب اپنے شیخ و مرشد کے ایماء سے ہندوستان واپس آئے تو ان فتنوں کی سرکوبی کے لیے ہنگامۂ درس و تدریس بلند کیا اور حدیث نبوی ﷺ کے ترجمہ و تشریح کا کام شروع کیا۔

شیخ نے امراء و حکام کی اصلاح کی جانب بھی توجہ فرمائی اور اس حیثیت سے اہم کام انجام دیے۔

(باقی)

کافر و مومن کی پہچان

(اقبال کی نظم "کافر و مومن" قرآن کی روشنی میں)

از

جناب محمد بدیع الزماں۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پٹنہ

خدائے تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے

"وہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن اور اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔" (سورۃ التغابن ۶۴۔ رکوع ۱)

غرض یہ کہ خدائے تعالیٰ صرف انسان پیدا کرتا ہے نہ کہ کافر یا مومن۔ یہ اس کا عمل و طرز فکر ہے جو اُسے کافر یا مومن بناتا ہے۔ اسی لئے اس آیت میں یہ کہا گیا کہ "اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔" اسی آیت کی ترجمانی اقبال نے اس طرح کی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(بانگ درا "طلوع اسلام")

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں کی پہچان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں بیشمار آیات وارد ہوئی ہیں جن میں مختلف زاویوں سے اس پہچان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسی ہی آیات کے پیش نظر اقبال نے مجموعی طور پر کافر و مومن کی پہچان "ضرب کلیم" کی صرف تین اشعار پر مشتمل درج ذیل نظم

"کافر و مومن" میں ان الفاظ میں رقم کی ہے:-

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے — تو ڈھونڈ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق

اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند — برندہ و صیقل زدہ و روشن و برّاق

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس طرح کافر کی پہچان یہ ہے کہ وہ آفاق (یعنی آسمان کا کنارہ) میں گم ہے یعنی آنکھیں ہونے پر بھی نہ اسے سمت کا پتہ ہے نہ راستہ معلوم۔ وہ ایک بھٹکا ہوا راہی ہے اس لئے کہ اس نے راستہ بتانے والوں کو جھٹلایا اور حقیقت کا علم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے نقلی معبودوں کو اپنا خدا سمجھ لیا اور ان کے سامنے سربسجود ہو کر اپنے کو حقیر بنا ڈالا۔ اس نے اپنی اساس "حقائق ابدی" پر قائم نہیں رکھی، برعکس اس کے ایک مومن کی پہچان یہ ہے کہ آفاق اس میں گم ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کو کھلی رکھ کر اس کائنات میں اللہ کی ساری آیات کو دیکھ کر توحید الٰہی کا قائل ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جب خدا نے اس کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے تو اسے کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں، جن کی باز پرس قیامت میں ہوگی۔ اس لئے وہ اپنے نیک ارادوں اور صالح اعمال سے تسخیر کائنات میں مصروف رہتا ہے، اُسے کہیں دقت پیش نہیں آتی اس لئے کہ راستہ بتانے والوں نے اُسے سیدھے اور ٹیڑھے راستوں کا علم دیا ہے اور وہ اپنی خودی کی تربیت کرکے اپنے کو خلیفۃ الارض کے منصب جلیل پر فائز ہونے کا اہل بنا لیتا ہے اور اس طرح یہ ساری کائنات اس کے تابع ہو جاتی ہے نہ کہ کافر کی طرح وہ خود کائنات کا تابع ہو جائے۔

کفر ایمان کی ضد ہے اور یہ محض ہستی باری سے انکار ہی کا نام نہیں بلکہ تکبر، فخر اور انکار آخرت بھی اللہ سے کفر ہی کے مترادف ہے۔ کافر اگر خدا کو مانتا بھی ہے تو محض ایک وجود کی حیثیت سے نہ کہ مالک،

آقا یا فرمانروا کی حیثیت سے، حالانکہ ایمان باللہ اسی حیثیت سے خدا کو ماننے کا نام ہے نہ کہ محض ایک وجود ہستی کی حیثیت سے۔ مفسرین نے قرآن کی روشنی میں کفر کے اجزائے مرکبات کی نشاندہی کی ہے، جس سے ایک کافر کے "آفاق میں گم ہونے کی توضیح ملتی ہے۔ "کفر" کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور ایمان کی ضد کہا جانے لگا۔ برعکس اس کے ایمان کے معنی ہیں ماننا اور تسلیم کرنا۔ قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ خدا کو سرے ہی سے نہ ماننا یا اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبود ماننے سے انکار کرنا کفر کے رویہ کی ایک صورت ہے، دوسری صورت یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ تیسری صورت یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کر لے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیئے مگر اللہ نے اپنی ہدایات پہنچانے کے لئے جن پیغمبروں کو واسطہ بنایا انہیں تسلیم نہ کرے یا یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے اور آخری صورت یہ کہ سب کچھ مانتے ہوئے عملاً احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور دنیوی زندگی میں اپنے رویئے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ خدائی احکام کی نافرمانی ہی پر رکھے۔

کفر کے انہی طرز فکر اور رویہ کو قرآن میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ کافر و مومن کا فرق اس طرح وارد ہوا ہے۔

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ

اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں، ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے۔" (سورۃ النساء ۴ ۔ رکوع ۲۱)

"وہ کافر، نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا ..... رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں ہمیشہ رہیں گے ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے"

(سورۂ ھود ۱۱ ۔ رکوع ۲)

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو، جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے دونوں یکساں ہو جائیں؟" (سورۃ الرعد ۱۳ ۔ رکوع ۳)

"کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ (سورۃ الرعد ۱۳ رکوع ۲)

اندھے سے مراد وہ شخص ہے جس کے آگے کائنات میں ہر طرف اللہ کی وحدانیت کے آثار و شواہد پھیلے ہوئے ہیں مگر وہ ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ رہا ہے اور آنکھوں والے سے مراد وہ ہے جس کے لئے کائنات کے ذرے ذرے اور پتے پتے میں معرفت کردگار کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ کفر درحقیقت احسان فراموشی ہے اور ایمان فی الحقیقت شکر گزاری کا لازمی تقاضہ ہے، جس شخص میں اللہ جل شانہ کے احسانات کا کچھ بھی احساس ہو وہ ایمان کے سوا کوئی راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اس لئے شکر اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں شکر ہوگا وہاں ایمان ضرور ہوگا۔ اس کے برعکس جہاں کفر ہوگا وہاں شکر کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا کیونکہ کفر کے ساتھ شکر کے کوئی معنی نہیں۔

مذکرۂ بالا آیات میں کافر و مومن کے فرق کو صریح دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جن سے ایک کے آفاق میں گم رہنے اور دوسرے میں خود آفاق کے گم ہو جانے کی وجہیں ملتی ہیں۔ اقبال کا زیرِ غور شعر درج ذیل آیات سے اور بھی واضح ہوتا ہے جن میں کفر اور ایمان کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے :-

" جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انھیں تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے "۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۳۴)

" ان میں سے (غفلت میں پڑے لوگوں میں سے) اکثر لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہوں گے اس لئے کہ وہ ایمان نہیں لائے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں اس لئے سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہم نے ان کے آگے ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ ہم نے اُنہیں ڈھانک دیا ہے۔ اُنھیں اب کچھ نہیں سوجھتا ان کے لئے یکساں ہے تم انھیں خبردار کر دیا نہ کرو، یہ نہ مانیں گے تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔ اُسے مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دے دو "۔ (سورۃ یٰسٓ ۳۶۔ رکوع ۱)

" اے نبی، تم صرف ان لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور

نماز قائم کرتے ہیں۔ جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لئے کرتا ہے اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں، نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سُنوا دیتا ہے مگر (اے نبی) تم ان لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ تم بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر "۔ (سورہ فاطر ۳۵۔ رکوع ۲)

ان آیات سے کافر و مومن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل دونوں پر بسیط روشنی پڑتی ہے اور اس کے نتیجے میں کافر کی آفاق میں نہ کوئی حیثیت باقی رہتی ہے اور نہ وہ آفاق پر حکمرانی کر سکتا ہے برعکس اس کے مومن اس عقیدے کے ساتھ چلتا ہے کہ اس کائنات میں خدا کے سوا کوئی اس پر حکومت نہیں کر سکتا اور وہ کائنات کو اپنا غلام سمجھتا ہے۔ آفاق میں گم ہو جانا مترادف ہے خودی کے مردہ ہو جانے سے۔ مومن اپنی خودی کو مرتبۂ کمال پر پہنچا کر اپنے اصلی مقام یعنی خلافتِ الٰہیہ پر فائز ہو جاتا ہے اور ساری کائنات اس کی مطیع ہو جاتی ہے۔ اسی کو اقبال نے آفاق کو مومن کے اندر گم ہو جانا کہا ہے۔ مومن کے مقابلہ میں آفاق کی کوئی حیثیت نہیں رہتی جب کہ آفاق کی طاقتوں کے سامنے کافر کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

کفر کوئی مذہب نہیں اور نہ کافر کسی خاص مذہب کے ماننے والے کو کہتے ہیں۔ اس کا مرتکب مسلمان بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ کفر ایک طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہے۔ البتہ اس کا مرتکب مومن نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی رو سے مسلمان اُسے کہتے ہیں جس نے اسلام کو اپنے لئے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا اور مومن وہ ہے جس نے دل سے اسلام کی رہنمائی کو حق مان لیا اور قرآن اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی کو فلاح کا موجب سمجھا۔ " مسلم شریف " میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" ایمان کا لذت شناس ہوگیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو اور اسلام ہی اس کا دین ہو اور محمد ہی اس کے رسول ہوں "

ایک مومن عملاً اطاعت کرنے والا ہے۔ اس کی یہ حالت نہیں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ حق تو اسی چیز کو مانے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے مگر عملاً اس کی خلاف ورزی کرے اور اپنی مخلصانہ رائے میں تو ان سب کاموں کو برا ہی سمجھتا ہے جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے مگر اپنی عملی زندگی میں ارتکاب انہی کا کرتا چلا جائے۔ ایمان نام ہے دل و نگاہ کو مسلمان بنانے کا۔ بقول اقبال ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضرب کلیم "تصوف")

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الاّ
لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

("بالِ جبریل"؛ غزل ۲۲)

اقبال نے انہی باتوں کے پیش نظر "بال جبریل" کی غزل ۱۲ میں مسلمانوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں، کافر مسلمان اور مومن مسلمان۔ کہتے ہیں :-

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

کافر اور مومن کی پہچان کا اصل کلیہ "عشق" یعنی "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" میں مضمر ہے۔ اس "عشق" کی شدت ہی کسی کو مومن بناتی اور اس کی کمی کسی کو کفر کی طرف راغب کرتی ہے ؎

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق (بال جبریل)

حضرت سلمان فارسیؓ کی عمر

(استدراک)

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، سابق ایڈیٹر البلاغ بمبئی

معارف نومبر ۱۹۸۴ء میں راقم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی عمر کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے اہل علم سے اس کے متعلق مزید تحقیق کی گذارش کی تھی، اور خود بھی تحقیق و تلاش کا خیال رہا، چنانچہ معلوم ہوا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی درازیٔ عمر کی روایت رفض اور تصوف کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے، اور اس حلقہ سے یہ روایت بعض کتابوں میں آئی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے :

گجرات کے قادری مشائخ رحمہم اللہ کے تذکرہ میں ان ہی کے خانوادے کے ایک بزرگ شیخ غریب اللہ ابن شیخ کبیر الدین محمد بن شیخ عبدالجلیل قادریؒ نے ۱۰۵۰ھ میں ملفوظاتِ قادریہ لکھی جس میں تحفۃ القادریہ اور نجات المریدین کے حوالہ سے یہ روایت درج ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پوتے شیخ جمال اللہ بن شیخ عبدالرزاقؒ اپنے دادا کے ہم شکل تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میرے دادا مجھے گود میں لیے ہوئے تھے، اسی حال میں مجھ سے فرمایا کہ :

" اے جمال اللہ! از من حضرت عیسیٰ علیہ السلام را سلام برسانی "

اور نجات المریدین میں ہے کہ انھوں نے اپنے پوتے سے یہ بھی کہا کہ :

" اخی سید محمد مہدی موعود را سلام رسانی "

شیخ جمال اللہ نے اس سے نتیجہ اخذ کیا کہ :

ازیں جا معلوم می شود کہ صاحب الزمان را بہ بینم و آں سلام کہ بر من امانت است باو رسانم۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں امام صاحب الزمان کو دیکھوں گا، اور جو سلام میرے پاس امانت ہے ان کو پہونچاؤنگا

اس واقعہ کو نقل کر کے مصنف ملفوظات قادریہ لکھتے ہیں :

باید دانست کہ بہ خاطر فاتر ایں کلیب عتبہ قادریہ میرسد کہ سلام گفتن حضرت غوث الثقلین بحضرت عیسیٰ روح اللہ یا صاحب الزمان از اں قبیل است کہ حضرت روح اللہ سلام خود را بدست سلمان فارسی بخدمت سلطان الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم معروض داشتند و سید عالم نیز بسلمانؓ مذکور فرمودند کہ سلامؑ ما بہ فرزند دلبند من محمد باقرؒ کہ او در صورت و سیرت و حلیہ مشابہت بما دارد رسانی، و عمر ایشاں وفا کرد تا امام محمد باقرؒ رادریافتند و سلام آنحضرت رسانندند۔

(ملفوظات قادریہ قلمی، ورق ۷۷، د م)

میرے خیال میں آتا ہے کہ حضرت غوث الثقلین کا حضرت عیسیٰ روح اللہ، یا امام الزمان (امام غائب) کو سلام بھجوانا ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ نے سلمان فارسی کے بدست اپنا سلام سلطان الانبیاء محمد مصطفےٰؐ کو بھجوایا تھا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی سے فرمایا کہ ہمارا سلام ہمارے فرزند دلبند محمد باقرؒ کو پہونچانا جو صورت، سیرت اور حلیہ میں ہمارے مشابہ ہے، چنانچہ حضرت فارسیؓ کی عمر نے وفا کی اور انھوں نے امام محمد باقرؒ کو پاکر آنحضرتؐ کا سلام پہونچایا۔

یہ خانقاہی خیالات بے بنیاد ہیں، حضرت سلمان فارسیؓ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۶ھ

میں ہوئی، اس سے پہلے وفات کے بارے میں بھی اقوال ہیں، اور امام محمد باقرؒ متوفی ۱۱۷ھ یا ۱۱۴ھ (ابوجعفر محمد باقر ابن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب، رضی اللہ عنہم) کی ولادت ۵۶ھ میں یعنی حضرت سلمان فارسیؓ کی وفات کے کم از کم ۱۹ سال بعد میں ہوئی، اس لیے دونوں حضرات میں ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ایک دوسرے کو سلام پہونچائیں۔

غالباً تیسری یا چوتھی صدی میں حضرت سلمان فارسیؓ کی درازیٔ عمر کی روایت مشہور کی گئی، اور چونکہ ان کا وطن ایک روایت کے مطابق اصفہان ہے اس لیے ابوالشیخ نے "طبقات الاصفہانیین" میں ان کا ذکر کرتے ہوئے اس کو نقل کر دیا۔

ابوالشیخ یعنی امام حافظ ابو محمد عبداللہ ابن محمد بن جعفر بن حیان اصفہانی متوفی ۳۶۹ھ رحمۃ اللہ علیہ نہایت ثقہ، مامون، ثبت، متقن، عابد و صالح اور تفسیر و احکام وغیرہ میں کثیر التصانیف محدث ہیں، موصل، حرّان، حجاز، عراق کے ائمہ و محدثین سے حدیث کی روایت کی ہے، پچانوے ۹۵ سال کی عمر میں آخر محرم ۳۶۹ھ میں انتقال کیا۔[1] ایسے ثقہ محدث کا اپنی کتاب میں اس قسم کی روایت نقل کرنا تعجب کی بات نہیں ہے، تواریخ و طبقات کا روایتی و درایتی معیار احادیث کے معیار سے مختلف ہوتا ہے، تاریخ واقعات کی کھتونی ہوتی ہے جس میں معیاری و غیر معیاری باتیں بیان کر دی جاتی ہیں، ان کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ ذوق و وجدان سے کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ محدثین نے عبّاد و زہّاد اور صوفیہ و مشائخ سے روایت کرنے میں شدت سے کام لیا ہے، مگر خود ان کے احوال و واقعات بیان کرنے میں نرمی برتی ہے، امام ابن جوزیؒ جرح و تعدیل میں شہرت کی حد تک شدت پسند ہیں، اور اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں

[1] العبر فی خبر من غبر ج ۲ ص ۳۵۲۔

صوفیہ شیخ کے بارے میں نہایت متنفر و منکر نظر آتے ہیں مگر یہی ابن جوزیؒ صفوۃ الصفوہ میں انکے معتقدین کی صف اول میں نظر آتے ہیں

حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسی نظریہ کے مطابق اصابہ میں امام ذہبی کے انکار کے باوجود ابو الشیخ کی نقل کردہ روایت کو کرامت کے طور پر تسلیم کرنے کا رجحان ظاہر کیا ہے۔

واضح ہو کہ تیسری اور چوتھی صدی میں بعض معمر کذابین نے غزوۂ خندق میں اپنی شرکت کا دعوی کیا ہے، موضوعات کے ایک مشہور راوی ہنّاد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں گوشت کے لوتھڑے کے مانند ایک معمر شخص کو دیکھا، اس نے بتایا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خندق کی کھدائی کر رہے تھے۔

اسی طرح امیر عبدالکریم بن نصر نے بیان کیا ہے کہ میں نے خلیفۃ الناصر کے ساتھ ۵۷۳ھ میں ایک معمر شخص جبیر بن حرب کو دیکھا جس نے بتایا کہ میں غزوۂ خندق میں موجود تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خندق کھودنے کا حکم دیا، اور دعائیں دیں[1]۔

اور امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ مُعَمّر بن بریک نامی ایک شخص نے چار سو سال کے بعد دعوی کیا کہ وہ غزوۂ خندق میں شریک تھا، اور مٹی اٹھانے پھینکنے میں تمام صحابہؓ سے آگے آگے تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شاباشی دیتے ہوئے اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان (سینہ پر) چار مرتبہ ہاتھ مارا اور دعا دی جس کی برکت سے وہ چار سو سال تک زندہ ہے[2]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان جھوٹے مدعیوں کے مقابلہ میں ایک طبقہ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے درازئ عمر کی روایت وضع کی حضرت سلمان فارسیؓ اسلام قبول کرنے کے بعد سب سے پہلے غزوۂ خندق میں شریک ہوئے تھے، اس لیے قبل اسلام کے زمانہ سے ان کی درازئ عمر کھینچ تان کر امام محمد باقرؒ متوفی سنہ ۱۱۴ھ یا سنہ ۱۱۷ھ کے زمانہ تک لائی گئی۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات محمد طاہر فتنی ص ۱۰۲ و ۱۰۳ [2] الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۱۸۵۔

تلخیص و تبصرہ

انگریزی ترجمۂ قرآن

معاصر رسالہ امپیکٹ انٹرنیشنل لندن میں ڈاکٹر ایس ایم درش کا ایک مضمون شایع ہوا ہے اس میں قرآن مجید کے ایک مستند ترین انگریزی ترجمہ کے متعلق سعودی عرب کے دار الافتاء والدعوۃ کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے، ذیل میں اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

(عمیر الصدیق)

قرآن مجید کے علوم و معارف سے صحیح واقفیت اور اس سے رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لیے ہر دور میں عربی زبان کی اہمیت امت مسلمہ کے پیش نظر رہی، اس میں عرب و عجم کی کوئی تخصیص نہیں، چنانچہ قرآنی علوم میں تبحر اور امتیاز کے شرف میں عرب علماء کے ساتھ غیر عرب علماء ہمیشہ شامل رہے، بلکہ بعض علمائے عجم تو اس حیثیت سے علمائے عرب سے زیادہ فائق اور ممتاز گذرے ہیں بعد میں جب مسلمانوں کا تنزل شروع ہوا تو عربی زبان کی مرکزی حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس لیے قرآن مجید کے معانی و مطالب کو مقامی زبانوں میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن ترجمہ و تفسیر کے کام کی اہمیت و نزاکت کی بنا پر علماء نے اس معاملہ میں عجلت سے کام نہیں لیا، چنانچہ ابھی یہ مسئلہ ان کے زیر غور ہی تھا کہ بعض غیر مسلم حضرات نے قرآن مجید کے ترجمہ کا کام شروع کر دیا، ظاہر ہے کہ وہ قرآن مجید کے ترجمہ میں ان پہلوؤں اور مصلحتوں کو مدنظر نہیں رکھ سکے

جن کا احساس مسلم علماء کو تھا، ان حضرات کے اپنے اپنے مقاصد و اغراض تھے، ان میں سے بعض تو قرآنی علوم سے محض اس لیے واقف ہونا چاہتے تھے کہ قرآن میں تحریف کر کے اس کے معانی کو مسخ کر کے پیش کر سکیں، اور اس میں ان کو کوئی جھجک یا پشیمانی بھی نہیں تھی، اس لیے علمائے اسلام کو خیال ہوا کہ اگر مشنریوں، سیاسی اداروں اور یہودی مستشرقوں ہی کے لیے یہ میدان خالی چھوڑ دیا گیا تو قرآن مجید میں تحریف کا عمل آسانی سے راہ پالے گا، چنانچہ اس کے بعد مختلف زبانوں میں خود مسلمانوں نے قرآن مجید کے ترجمے پیش کیے، یہاں خاص طور سے انگریزی ترجموں کے متعلق ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے،

قرآن کے انگریزی ترجموں کے متعلق علماء کی رائے عام طور پر یہ ہے کہ ان میں کچھ نہ کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں اور ان غلطیوں اور خامیوں کی وجہ یہ ہے کہ یا تو بعض مترجمین آیات کے شان نزول اور کلام کے سیاق و سباق سے واقف نہیں تھے، یا پھر قرآن کو زمانہ کے نظریات کے مطابق پیش کرنے کے شوق میں ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں، اسی لیے عرصہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان تراجم کا ازسرنو جائزہ لے کر ایک مستند ترین ترجمۂ قرآن شائع کیا جائے، سعودی عرب کے دار الافتاء والدعوۃ والابحاث العلمیۃ نے یہ ذمہ داری قبول کی، اس ادارہ کی دنیا بھر میں شاخیں ہیں، اس لیے اس کو اس ضرورت کا شدت سے احساس ہوا، چنانچہ شاہ فہد پرنٹنگ کامپلکس کا قیام صرف قرآن مجید کی طباعت و اشاعت ہی کے لیے عمل میں آیا، جائزہ کا کام شروع ہوا تو ممتاز علماء سے درخواست کی گئی کہ وہ متفقہ طور پر موجودہ تراجم میں ایک سب سے بہتر ترجمہ کا انتخاب کریں، تاکہ اسی ترجمہ پر یکسوئی سے کام کیا جا سکے، علماء نے اس کے لیے مرحوم عبداللہ یوسف علی کے ترجمۂ قرآن کو پسند کیا، اس کے بعد دوسرے اہم اسلامی اداروں کی رائیں اور معروضات حاصل کی گئیں، تاکہ وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔

ایک اہم تجویز یہ منظور ہوئی کہ قرآن میں مذکور اعلام و اسماء و اماکن کو ترجمہ میں بھی اصل کے مطابق ہی باقی رکھا جائے، یورپ کے مترجمین نے عام طور سے اللہ اور دوسرے اسمائے حسنیٰ کا ترجمہ گاڈ (God) سے کیا ہے، حالانکہ لفظ اللہ میں جو معنویت ہے وہ لفظ گاڈ سے ادا نہیں ہو سکتی، لفظ اللہ کے استعمال سے عبارت زیادہ واضح ہوتی ہے، اور اس سے دوسری اسلامی اصطلاحات سے واقفیت میں بھی زیادہ مدد ملتی ہے۔

رسول کا ترجمہ عموماً میسنجر (Messenger) سے کیا جاتا ہے، اب اس کی جگہ لفظ اپوسل (Apostle) منتخب کیا گیا ہے، کہ اس سے اللہ کے منتخب بندے، اس کے رسول اور دوسروں کے لیے قابل تقلید نمونہ وغیرہ مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔

یہ جائزے اور تجویزیں ایک تیسری کمیٹی کو سپرد کی گئیں، اس نے ترجمہ کو جدید ترین اور جامع ترین بنانے کے لیے کچھ اور مفید باتیں منظور کیں، یعنی قرآن کی اسلامی اور تاریخی اصطلاحات کو ترجمہ میں بعینہٖ قائم رکھا جائے، مثلاً زکوٰۃ اور توراۃ وغیرہ الفاظ کو ترجمہ میں بھی اپنی اصلی شکل ہی میں رہنے دیا جائے۔

اس کمیٹی نے جو کام انجام دیا اس کے مفید اور نفع بخش ہونے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا تاہم ترجمہ کو حوالۂ طباعت کرنے میں جلد بازی نہیں کی گئی، اور ایک اور آخری کمیٹی کے سامنے پورا کام پیش کیا گیا، جس نے آخری نگاہ ڈالنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس کی زبان عمدہ اور حواشی جامع ہیں جو مستند اسلامی مصادر سے ماخوذ ہیں۔

اتنے سارے مراحل طے کرنے کے بعد یہ ترجمہ شائع کیا گیا، اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، اور اسے قبول عام بھی حاصل ہے، تاہم چند باتیں اب بھی قابل لحاظ ہیں اول تو عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں پہلی دفعہ چھپا تھا، اس وقت

مسلم ممالک میں مغرب کی عقلیت کا فلسفہ چھایا ہوا تھا، جس کے مقابلہ میں مسلمان دانشوروں کا رویہ معذرت آمیز تھا، اس کا اثر قرآن مجید کے ترجمہ میں بھی موجود ہے، مثلاً قرآن مجید نے جنت اور جہنم کا ذکر قطعی واضح کیا ہے، اس لیے چاہے ہم کو ان کی اصل کیفیت کا علم نہ ہو مگر یہ واقعی اور حقیقی ہیں، انھیں تمثیلی اور علامتی نہیں کہا جاسکتا، لیکن عقلیت پسند لوگ کہتے ہیں کہ جنت سے روحانی تسکین مراد ہے اور جہنم احساس گناہ، پشیمانی اور اضطراب و الم کی کیفیتوں کی غماز ہے۔

ثانیاً مذہبی نکات پر کم توجہ کی گئی ہے اور غیر اہم امور اور نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی پر اس میں زیادہ زور دیا گیا ہے، جن میں مصلحت اور وقت کی ضرورت کا رجحان نمایاں معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ مفروضہ کہ گوتم بدھ بھی پیغمبر تھے، جزا و سزا کی ابدیت و ہمیشگی کے سلسلہ میں بھی مبہم بات لکھی گئی ہے۔

عقوبات اور ان کی سزاؤں کے سلسلہ میں مرحوم عبداللہ یوسف علی کو بھی اشکال ہوا ہے اور وہ انھیں رحم و مروت اور دردمندی کے انسانی جذبات کے منافی سمجھ بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزائیں ہیں، ہم خود کو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں زیادہ دردمند اور رحم دل ثابت نہیں کر سکتے، لوگوں سے رحمت و شفقت اور مروت کا معاملہ اس سے بالکل جدا چیز ہے۔

فقہی مباحث میں بھی ان کا رویہ صاف معذرت خواہانہ اور مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے، مثلاً تعدد ازدواج کی بحث میں ان کا یہ رویہ ان کی خاص تہذیب و ثقافت اور تعلیمی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے، نفقۂ مطلقہ کی بحث میں بھی یہی رویہ اور انداز کارفرما ہے، وراثت اور ظہار کے مسائل میں ان کی نظر ان حالات و اسباب پر نہیں ہے جن کی وجہ سے ان مسائل کے احکام وضع ہوئے۔

ان امور سے قطع نظر یہ ترجمہ مستند اور اصل قرآن کی روح کے مطابق ہے، نیز اس کے حواشی قابل اعتماد اور اطمینان بخش ہیں، اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب انگریزی زبان میں قرآن مجید کے مستند اور قابل وثوق ترجمہ کی ضرورت پوری ہوگئی ہے۔ "ع۔ص"

اخبارِ علمیہ

روس کے شہر لینن گراڈ میں 'اسلام' کے نام سے ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کی گئی ہے اور اب یہ قاموس علمی اشاعت کے مرحلہ میں ہے، یہ کتاب اکاڈمی آف سائنسز کے استشراقی علوم کے ادارہ کی زیر نگرانی تیار کی گئی ہے، یہ تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مذہب اسلام، تاریخ اسلام اور نظریات اسلام کے موضوعات پر مضامین ہیں، جدید دور میں اسلام کی اہمیت اور اس کے مذہبی رجحانات پر بھی کئی مقالے ہیں۔

قاموس کے مرتب خاص اسٹانسی لاؤ روزوروف نے بتایا کہ روس میں اس سے پہلے اسلام کے نام پر جو علمی کام ہوئے ان کا تعلق زیادہ تر روسی مسلمانوں سے ہے، مگر ادھر زیادہ گہرائی سے کام ہوا ہے چنانچہ اس قاموس میں قرآن مجید کے کئی نسخوں پر تاریخی ماخذ کی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور تصوف پر مفصل بحث ہے۔

اس کے مضمون نگاروں میں روسی مستشرقین کے علاوہ دمشق، بغداد، طہران اور تونس کے اہل علم حضرات بھی شامل ہیں۔

ادارہ کا منصوبہ یہ ہے کہ اسلام پر جو مخطوطات دستیاب ہیں ان کو شائع کیا جائے، چنانچہ کئی نادر و نایاب روسی اور غیر روسی مخطوطے شائع کیے جا رہے ہیں، ان میں یمن کا ایک مخطوطہ بھی ہے جس میں پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں وہاں کی مذہبی اقلیتوں کے حالات درج ہیں، چند روزی رسالے اور گیارہویں صدی کا ایک مخطوطہ بھی زیر اشاعت ہے جو ڈربن سے حاصل کیا گیا ہے

حال ہی میں واشنگٹن میں اسلامی علوم و صنعت (سائنسز اور ٹکنولوجی) کے ایک بین الاقوامی ادارہ کا رجسٹریشن کرایا گیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی علوم اور ٹکنولوجی کو فروغ دیا جائے اس کے لئے اس نے تین بنیادی کام شروع کئے ہیں (۱) اسلام کا فلسفۂ سائنس اور ٹکنولوجی (۲) سائنس اور ٹکنولوجی کی اسلامی سماجیات اور (۳) سائنس اور ٹکنولوجی کی اسلامی تاریخ۔

یہ ادارہ بعض خاص دوسرے اداروں کے علاوہ ان موضوعات پر کام کرنے والوں کے لئے بھی مددگار ثابت ہوگا۔ اس ادارہ کے چیرمین پروفیسر حسین نصر اور ڈائرکٹر الیں وقار احمد حسینی ہیں، کئی ممالک کے ممتاز مسلمان علماء اور دانشور اس کے ممبر ہیں جن میں ہمدرد فاونڈیشن کراچی کے بانی حکیم محمد سعید صاحب بھی شامل ہیں۔

امریکا اور یورپ میں مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ اور فروغ کی اہمیت کا احساس ہے، ابھی عظیم تر واشنگٹن کے تقریباً ۵۰ مسلم مراکز و مساجد کے نمائندہ افراد پر مشتمل ایک یوتھ کاونسل کی تشکیل کی گئی ہے، اس کا آغاز اس سال کے شروع میں ایک سمینار سے ہوا تھا جس میں باہم تبادلہ خیال کا موقع ملا اور اب یہ انجمن باقاعدہ معرض وجود میں آگئی ہے۔

اسی واشنگٹن میں ایک اور انجمن انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (IIIT) کے نام سے قائم ہے اس کے زیر اہتمام ۹ر جولائی سے ۲۱ر جولائی تک فرانس میں اسٹراس برگ کی یونیورسٹی آف ہیومن سائنسز میں اسلامی معاشیات کے موضوع پر دو ہفتہ کا سمینار ہوا، مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی، ڈاکٹر یوسف ابراہیم، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اور ڈاکٹر حامد ابوسلیمان وغیرہ شامل ہیں، سمینار کے انعقاد میں پیرس کے ایک اسلامی معاشیات کے ادارہ CERFI نے اپنا تعاون دیا۔

ہندوستان میں مذہبی مناظرے اب اگلے وقت کی باتیں ہیں لیکن یورپ میں آج بھی عوام ان مناظروں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں، مشہور اسلامی مناظر احمد دیدات اور مسیحی عالموں میں برابر یہ مذہبی مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اعلان نظر سے گزرا کہ برمنگھم میں لبنان کے مسیحی عالم ڈاکٹر انیس سروش سے احمد دیدات کا مناظرہ ہوگا، مناظرہ ہال میں نشستوں کے لئے اگرچہ کوئی داخلہ فیس نہیں ہے لیکن نشست کو محفوظ کرانے کے لئے دو پونڈ ادا کرنے ہوں گے۔

(ع ۔ ص)

معارف کی ڈاک

(۱)

پیرس۔ فرانس ۳۰ر جولائی ۱۹۸۸ء مطابق ۱۶ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ

مکرم و محترم متعنا اللہ بطول حیاتکم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ؛

جولائی کا شمارہ جولائی ہی میں پہونچ گیا، ممنون و مسرور بھی ہوا اور شششدر بھی، جزاکم اللہ احسن الجزاء، شاید جلد بازی[1] کے باعث مجھ سے ہی غلطی ہوئی تھی، مگر غلطی کی اصلاح ہو جائے تو اچھا ہے؛

صفحہ ۵۶ر سطر ۱۵ میں چھپا ہے "۵ھ کے غزوۂ خندق"۔ "یہ خیبر" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۵۹ر سطر ۷: "اُن دن"۔ کیا یہ "اُن دنوں" نہیں ہونا چاہیے؟

صفحہ ۶۰ر سطر ۱۵: "اس سے انتقام لینے کا حکم دیا"۔ واضح نہیں، کہنا یہ ہے: "اس کا انتقام لینے کے لیے رسول اکرمؐ نے حکم دیا"۔

نیاز مند: م ح ا

---

(۲)

صدق جدید لکھنؤ ۶ر اگست ۱۹۸۸ء

عزیز مکرم! سلام مسنون۔ جولائی کا معارف ملا، اس کے شذرات کا ٹکڑا حصہ میں "نشیات جدید" کے اداریہ میں نقل کیا ہے، تراشہ روانہ ہے۔ معارف کا یہ نمبر بہت خوب ہے، مولوی غلام محمد صاحب حیدرآبادی کا مضمون سید صاحب مرحوم کے تصوف سے متعلق قابل قدر و قابل مطالعہ ہے ڈاکٹر حمید اللہ کا مضمون ان کی محققانہ شان کے عین مطابق ہے۔ عزیزی عمیر الصدیق کا مضمون مجنوں گورکھپوری سے متعلق پڑھا، مرحوم کی مرتب کردہ زہر عشق جس کے ساتھ عم مرحوم مولانا دریابادی کا مشہور مضمون "اودھ کا بدنام شاعر" بھی شامل ہے، غالباً ان کی نظر سے نہیں گذرا، کیونکہ اس کا تذکرہ اس مضمون میں نہیں ہے[2] مجنوں صاحب عم مرحوم کی ادبیت کے معترف تھے۔ پچھلے نمبر میں دسنوی صاحب نے اخبار علمیہ کا سلسلہ ختم کیا تھا، معارف کے اولین زمانہ میں عرصہ تک اس عنوان کے تحت عم مرحوم لکھتے رہے تھے، یہ سلسلہ باقی رہنا چاہیے[3]۔

خیر طلب: عبد العلی القوی

---

[1] جلد بازی ہی میں ایک لکھے ہوئے مضمون کو روک کر اسے شائع کیا گیا، اس لیے غلطیوں پر ہم لوگوں کی بھی نظر نہیں پڑی (معارف) [2] مولانا کے مرحوم کے مضمون کا علم تھا، مگر وہ دستیاب نہیں ہو سکا (معارف) [3] ان شاء اللہ (معارف)

مطبوعات جدیدہ

علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات | مرتبہ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۸۸ مجلد مع خوش رنگ گرد پوش

قیمت ۵۰ روپے، پتہ ۱۔ مجلس نشریات اسلام ۱۔ کے۔ ۳۔ ناظم آباد کراچی ۱۸

مولانا سید سلیمان ندویؒ پر بہ کثرت مضامین کے علاوہ کئی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے مبسوط "حیات سلیمان" ہے جس کو سید صاحب کے شاگرد رشید مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے مرتب کرکے دارالمصنفین سے شائع کیا ہے مگر ان کی شخصیت کے جلوے نہایت گوناگوں اور کمالات کا دائرہ بہت وسیع ہے اس لئے کسی ایک کتاب میں سارے پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، خود سید صاحبؒ کے لازوال علمی و تحقیقی کارناموں کی وجہ سے بھی ان کی زندگی و شخصیت کے بعض گوشے مستور رہے اسی لئے ان کا ادبی کمال اور انشاپردازی کا جوہر بھی عام نظروں سے اوجھل رہا، حضرت سید صاحب سے جناب نعیم صدیقی کا پشتینی تعلق ہے، انہوں نے ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی اور دارالمصنفین میں تحریر و تصنیف کی تربیت حاصل کی، اس لئے حضرت سید صاحب کی ذات سے انھیں والہانہ عقیدت ہے، اسی بنا پر ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کو انھوں نے اپنی تھیسس کا موضوع بنایا اور دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں اسے بڑے شوق اور دلچسپی سے مکمل کرکے سنہ ۷۹ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی، اس سیر حاصل مقالہ سے ادب و انشاپردازی میں سید صاحب کا امتیاز و کمال پوری طرح نمایاں ہوگیا ہے، مقالہ پہلے کتابی صورت میں ہندوستان

سے اور اب پاکستان سے بڑے اہتمام سے کسی قدر رد و بدل کے بعد شائع ہوا ہے، یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں عہد و ماحول کی مرقع آرائی کی ہے۔ اس میں ہندوستان کی سیاسی بیداری ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی قومی جد و جہد، ہندوؤں اور مسلمانوں کی اصلاحی، معاشرتی اور تعلیمی تحریکوں اور ادبی حالات و رجحانات کا جائزہ لے کر ان کے ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو سید صاحب کی زندگی پر مترتب ہوئے، دوسرے باب میں سید صاحب کے حالات زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے، اس ضمن میں ان کی علمی، تعلیمی، دینی، قومی اور ملی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی ہے، اسی باب میں ان کا سراپا، اخلاق و سیرت کے جلوے اور بوقلموں شخصیت کے مختلف گوشے نمایاں کئے ہیں۔ یہ دونوں ابواب تمہیدی نوعیت کے ہیں، ان کے بعد کے پانچ ابواب میں ان کے ادبی کمالات کے خط و خال واضح کئے ہیں، سید صاحب کی کوئی کتاب بھی ادبی دلکشی اور شگفتگی سے خالی نہیں ہے لیکن مصنف نے تیسرے باب میں ادبی خصوصیات کی حامل کتابوں نقوش سلیمانی، خیام، حیات شبلی اور یاد رفتگاں کو جائزہ کے لئے منتخب کیا ہے اور ان کی مدد سے ادب و انشاء میں ان کا کمال دکھایا ہے، چوتھے باب میں سید صاحب کے خطوط کی ادبی دلآویزی و رعنائی کا ذکر ہے، اس میں ان کے خطوط کے تین مجموعے برید فرنگ، مکاتیب سلیمان (مسعود عالم ندویؒ) اور مکتوبات سلیمانی (مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ) کے علاوہ معارف میں چھپے خطوط بھی زیر بحث آئے ہیں، پانچویں باب میں شاعری پر بحث کی گئی ہے اس میں ان کے عارفانہ کلام پر خصوصیت سے بحث و تبصرہ کیا ہے، چھٹے باب میں سید صاحب کی تنقید نگاری کی خصوصیات دکھانے کے لئے پہلے اردو میں تنقید کی مختصر تاریخ قلمبند کی ہے اور آخر میں شبلی و سلیمان کے انداز تنقید کے خصوصیات بیان کئے ہیں، ساتواں باب سید صاحب کی مجلہ نگاری کی خدمات کے لئے خاص ہے، اس میں الندوہ، الہلال اور معارف کے مقاصد، خصوصیات اور مضامین اور مضمون نگاروں کی اہمیت دکھائی ہے، ان رسالوں

کی روشنی میں ان کی اس حیثیت کو نمایاں کیا ہے، آٹھویں باب میں سید صاحب کے طرز نگارش اور اسلوب تحریر پر اچھی اور سیر حاصل بحث کی ہے، پہلے اردو نثر کے ارتقا اس میں سلاست نگاری کی ابتدا اور سید صاحب کے اسلوب کے تدریجی مراحل کا ذکر کر کے ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلیؒ کے تتبع کے باوجود خود ان کا بھی ایک انفرادی اور امتیازی رنگ تھا، آخری باب میں پوری کتاب کا لب لباب تحریر کر کے سید صاحب کے ادبی درجہ و مرتبہ کا تعین کیا ہے، مصنف سید صاحب کی عقیدت میں سرشار ہیں مگر یہ چیز ان کی بعض تصانیف کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی میں مانع نہیں ہوئی لیکن بحث و تحقیق کے ان نتائج اور تجزیوں سے کلی اتفاق نہیں کیا جا سکتا، کتاب کی ترتیب و تبویب سے مصنف کے اچھے ذوق اور بہتر سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے، زبان و بیان صاف اور سلیس ہے۔

نگار معنی: مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۳۶، مجلد قیمت ۳۵ روپیے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم کی زندگی قدیم شرافت و ہند اسلامی تہذیب کا بہت دلکش نمونہ تھی، فارسی شاعری اسی تہذیب کا ایک حسین مظہر ہے، جس کا ڈاکٹر صاحب کو بہت عمدہ ذوق تھا، اسی لیے انھوں نے فارسی کے اچھے اور اپنے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض تیار کی تھی، اب ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور اردو کے ممتاز اہل قلم پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے یہ بیاض شائع کی ہے، تاکہ جن اشعار سے کبھی ذاکر صاحب مرحوم اپنی فرصت کے وقتوں میں لطف اندوز ہوتے تھے ان سے عام قارئین بھی کیف و انبساط حاصل کریں، بیاض میں مندرجہ ذیل شعرائے ذی کمال کے اشعار درج ہیں، مولانا روم، سعدی، خسرو، حافظ، فیضی، عرفی، نظیری، مظہر جان جاناں، اور

غالب، یہ نام ہی انتخاب کی قدر و قیمت اور ذاکر صاحب مرحوم کے مذاق کی بلندی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں، لیکن خود نفس انتخاب بھی نہایت خوش مذاقی کا نتیجہ اور نور علی نور کے مصداق ہے، بیاض کی اشاعت ہی کچھ کم خدمت ادب نہ تھی، لیکن پروفیسر ضیاء صاحب نے اس پر اکتفا نہ کر کے ایک دلچسپ اور سیر حاصل مقدمہ بھی لکھا ہے جو خود ان کے حسن ذوق اور فارسی شعر و ادب سے دلچسپی کا غماز ہے، اس میں ذاکر صاحب کی ذہانت، فارسی شعر و ادب سے دلچسپی اور اس سے ان کے فیضان حاصل کرنے کا ذکر ہے، علاوہ ازیں اس میں فارسی شاعری کی بعض خوبیوں، شعرائے فارسی کے عشق کی آگ کو بھڑکانے اس میں توحید و تصوف کی روح پھونکنے اور صوفیۂ کرام کی محبت، دلجوئی اور دلداری کی تعلیم وغیرہ کا بھی دلآویز انداز میں تذکرہ ہے۔

جوہر نامہ:- مرتبہ جناب حکیم محمد عرفان الحسینی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، مجلد مع خوبصورت و مصور گردپوش، قیمت ۴۰ روپیے، پتے:- (۱) محمد علی لائبریری G/A No کنہائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۳، (۲) مکتبہ برہان جامع مسجد، دہلی۔

کلکتہ سے ملک و ملت کے شیدائی مولانا محمد علی جوہرؒ کا خاص تعلق رہا ہے، یہاں کے اصحاب ذوق نے ان کی نسبت سے محمد علی لائبریری قائم کی ہے اسکے زیر اہتمام ۱۹۸۰ء میں مولانا محمد علیؒ پر ایک باوقار سمینار ہوا تھا جس میں ملک کے ممتاز علمی و تعلیمی اداروں کے فضلاء اور سرکردہ علمی و ادبی شخصیتوں نے مولانا کی زندگی، شخصیت اور کمالات کے تقریباً تمام پہلوؤں پر پُرمغز مقالے پڑھے تھے، جوہر نامہ ان ہی مقالات کا مجموعہ ہے، حسب ذیل مضامین اور مضمون نگاروں کے ناموں سے اس کے تنوع اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا، ہندوستان کی سیاسی بیداری میں مولانا محمد علی کا حصہ (پروفیسر خلیق احمد نظامی)۔ ہم مولانا محمد علی جوہر سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟ (سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مرحوم)۔ مولانا محمد علی جوہر (پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)۔ ملک وملت کا شیدائی: مولانا محمد علی (جناب عبد اللطیف اعظمی)۔ مولانا محمد علی اور ان کے بعض فضائل وکمالات (مولانا ابو العرفان ندوی) مولانا محمد علی کی صحافت اور اس پر سیاسی اثرات (احمد سعید ملیح آبادی) مولانا محمد علی جوہر اور کلکتہ، (محمد اسحاق) محمد علی جوہر کی گھریلو زندگی کا ایک جائزہ (خالدہ حسینی)۔ راقم الحروف کو بھی محترمی سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم کی معیت میں سمینار میں شرکت اور مولانا کی شاعری پر اپنا حقیر مضمون پیش کرنے کی سعادت میسر آئی تھی، رئیس الدین فریدی، ڈاکٹر اکمل ایوبی اور ڈاکٹر احتشام بن حسن کے مضامین بھی توجہ کے لائق ہیں، اصحاب ذوق اور مولانا محمد علی جوہر کے قدر دانوں کو کلکتہ کے مشہور اور باوقار عالم اور حاذق طبیب مولانا محمد زماں حسینی کے لائق فرزند حکیم محمد عرفان حسینی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے سمینار میں پڑھے گئے تمام مقالات کو سلیقہ واہتمام سے شایع کرکے دوسروں کو بھی مولانا کی قابل فخر اور لائق رشک زندگی سے سبق حاصل کرنے کا موقع دیا، آخر میں لائق مرتب نے مولانا کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ مجموعہ دو آتشہ ہوگیا ہے، ۸۵ء میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم اور جناب عبد اللطیف اعظمی نے اس سمینار کی جو بہت دلچسپ اور مفصل روداد لکھی تھی اس کو بھی شروع ہی میں شامل کیا گیا ہے، اس کتاب سے مولانا محمد علی کی کثیر الجہات شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

تذکرۂ نعت گویان بریلی مرتبہ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپیے۔ پتے:

(۱) از مصنف، ۳، پھول والان، بریلی (۲) مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

روہیلکھنڈ خصوصاً بریلی کے خدمات علم وادب کا تذکرہ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا خاص موضوع ہے، قارئین معارف کے لیے ان کا نام نیا نہیں ہے، وہ اس کے صفحات پر بریلی کے علمی وادبی خانوادوں اور وہاں کے ممتاز شعراء وارباب کمال کے بارے میں بسوط مضامین سپرد قلم کرتے رہے ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو بریلی کے نعت گو شعراء کا تذکرہ ہے، اس کے متن میں ۸۲ اور ضمیمہ میں چودہ ۱۴ نعت گو شعراء کا مختصر حال اور ہر ایک کی ایک ایک نعتیہ غزل درج ہے، ڈاکٹر صاحب کی حشو وزوائد سے پاک اور سلیس تحریر نے لطف دوبالا کردیا ہے، مقدمہ میں بریلی میں اردو شاعری کے آغاز وارتقاء پر گفتگو کرنے کے بعد خواتین روہیلہ کی سخن سنجی، سخن پروری، شعراء کی فکر سخن اور نعت گوئی کی جانب میلان اور اس کتاب کے مآخذ کا ذکر ہے۔ نعت گوئی بڑی نازک صنف کلام ہے، ع ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر۔ اس لیے زمین نعت میں دادِ سخن دانی دینے میں ہر قدم پر لغزش کا امکان رہتا ہے، اس تذکرہ کے نعتیہ اشعار بھی اس سے خالی نہیں ہیں، تاہم اس کی بدولت بریلی کے نعت گو شعراء کو نئی زندگی نصیب ہوگئی، اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا یہ ادبی کارنامہ تحسین وتبریک کا مستحق ہے۔

بحث ونظر:۔ مرتبہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت سالانہ ۴۰ روپے فی شمارہ ۱۰ روپے، پتہ:۔ دفتر بحث ونظر، پھلواری شریف، پٹنہ

اردو میں سنجیدہ، باوقار اور بلند پایہ علمی وتحقیقی رسالوں کا فقدان ہے اور جو ہیں وہ سخت مشکلات میں گرفتار ہیں، اب جس طرح کے رسالوں کی طلب اور مانگ ہے اس میں کسی نئے معیاری علمی وتحقیقی مجلہ کو نکالنے کی ہمت وجرأت کوئی مجاہد ہی کرسکتا ہے، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صرف نام ہی کے نہیں عمل کے بھی مجاہد ہیں جو مسلمانوں کے ہر محاذ پر ایک سرفروش اور جانباز مجاہد کی طرح اپنے جوہر دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، تقریر وخطابت کے میدان کو ناکافی سمجھ کر انھوں نے

تحریر و صحافت کے میدان میں بھی پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ یہ فقہی، علمی اور دینی سہ ماہی رسالہ اسی میدان کی فتوحات میں ہے جس کا دوسرا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موجودہ فقہی مسائل پر مفید علمی مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ "تحقیقاتِ فقہیہ" کے زیر عنوان سوالنامہ اور اس کا جواب شائع کیا گیا ہے، اس میں ناقابل علاج اور زندگی سے مایوس مریضوں کو اذیت ناک اور تکلیف دہ زندگی سے نجات دلانے کے لئے ہلاک کرنے والی دوائیں یا علاج ترک کر کے موت کے گھاٹ اتارنے کے حکم کے بارہ میں آٹھ علماء سے ایک سوال کا جواب طلب کر کے شائع کیا ہے، ان فتووں پر فاضل مدیر نے بڑا فاضلانہ تبصرہ کیا ہے، اسی حصہ میں مال رہن سے انتفاع کے بارہ میں مولانا منت اللہ رحمانی نے ایک استفتاء کا بہت مدلل اور محققانہ جواب دیا ہے، فتاوی اور قضایا کے زیر عنوان موجودہ زمانہ کے بعض مسائل کے جواب اور فیصلے شائع کئے گئے ہیں، اصولی مباحث کے زیر عنوان فقہا کی مشہور اصطلاح استصلاح پر ایک مفید مضمون درج ہے، موقع کی مناسبت سے حج پر بھی ایک اچھا مضمون دیا گیا ہے، اداریہ میں مدارس دینیات کے تعلق سے ایک اہم مسئلہ کی جانب توجہ دلائی ہے آخر میں نئی کتابوں پر تبصرہ کا کالم بھی ہے، یہ سارے مضامین فاضل مدیر ہی کے قلم سے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ ہر ملی محاذ پر پیش پیش رہنے کے باوجود مولانا نے ان عالمانہ مضامین کے لئے کیسے وقت نکالا، اگر وہ سوالنامہ میں ایک ہی طبقہ و مسلک کے بجائے دوسرے حلقۂ فکر کے علماء کے جواب بھی شائع کرتے تو یہ سلسلہ اور مفید ہوتا، یہ نیا علمی، فقہی، تحقیقی اور دستاویزی رسالہ خیر مقدم اور قدر دانی کے لائق ہے۔

افسونِ حرص: از ڈاکٹر ایم۔ اے۔ دل حسینی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات: ۱۲۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپے پتہ ادارہ روح ادب، گھوناتھ پورہ، مئوناتھ بھنجن یو۔پی۔

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ دل حسینی کو شعر و سخن کا اچھا ذوق اور تغزل سے زیادہ مناسبت ہے اس مجموعۂ غزل میں عہد و احول کی عکاسی اور تغزل کی لطافت کے علاوہ اسکا پیرایۂ بیان بھی دلکش ہے۔ "ض"

جلد ۱۴۲ ماہ محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء عدد ۳

مضامین

مقالات